

ابن انشا

آوارہ گرد کی

ڈائری

سفر نامہ

لاہور اکیڈمی

چوک اردو بازار لاہور

توین نمبر ۸۷۲۲۶

جسٹ حق محفوظ

طبع اول :	جولائی ۱۹۷۱ء
طبع دوم :	جولائی ۱۹۷۲ء
طبع سوم :	ستمبر ۱۹۷۳ء
طبع چہارم :	نومبر ۱۹۷۶ء
طبع پنجم :	اپریل ۱۹۷۸ء
قیمت :	۱۵ روپے .

ناشر : سردار محمود چودھری
مطبع :

سَرَدے

مارک ٹوین نے اپنے ایک ناول کے دیباچے میں لکھا تھا :

”اگر کوئی شخص اس کہانی میں متصفہ توئی کرتا ہو یا یا گیا تو
اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ اگر کسی شخص نے اس کتاب
سے سبق لینے کی کوشش کی تو اسے ملک بدر کر دیا جائے گا
اور اگر کسی نے اس میں جھٹ جھٹ کوشش کرنے کی جرأت
کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔“

ہم طبیعت کے ایسے متشدد نہیں ہیں جیسے مارک ٹوین تھے۔ تاہم اتنا خبردار
کریں گے کہ اگر کسی نے اس سفر نامے سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو یہ اچھا
نہ ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص اس سفر نامے کو گائیڈ بنا کر اس کی مدد سے سفر کرنے کی
کوشش کرے گا، نتائج کا خود ذمہ دار ہوگا۔ اصل میں یہ اس قسم کا سفر نامہ نہیں، جو
سفر کے اختتام پر لکھا جاتا ہے۔ یہ تو ایک ادارہ گرد کی ادارہ ڈائری کے مشترک اوراق

ہیں۔ ۱۹۶۷ء کے اواخر میں ہم یونیسکو کی دعوت پر یورپ اور مشرق وسطے کے ملکوں کے دورے پر گئے تھے۔ وہاں جو کچھ ہم پر اور ان ملکوں پر ہمارے اقصیٰ لڑتی رہی بے کم و کاست رقم کر کے اجازتیں بھیج دیا کرتے تھے پھیل تھیں کیا لکھا تھا۔ یہ کبھی یاد نہ رہا۔ چونکہ ہمیں جمہوریت کی کبھی عادت نہیں رہی لہذا جو روگیا سورہ گیا۔ مثلاً چیکوسلوواکیا کی راجدھانی پراگ میں ہم نے جو چار بوجھین دن گزارے وہ یوگوسلاویہ میں تھے۔ سوچا ان پر فوراً بیٹھ کر دہشت گردی سے لکھیں گے۔ سو یہ نہ ہوا۔ وہ دن کبھی نہ آیا۔ دارما کی یا ترائی دودا د بھی نہ لکھ سکے کہ اب کون لکھے۔ یہی حال دوسرے (سوئٹزرلینڈ) کے احوال کا ہے۔ اب تو ان کی یادیں پسوں کے سماں ہیں۔

ہمارا یہ سفر پورے تین مہینے کا تھا۔ ایک مہینہ لندن میں۔ دو ہفتے جرمنی میں اور باقی ایام میں باقی دیار و امصار۔ یونیسکو کا روزانہ جتے ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کسی اپنے ہوٹل میں ٹھہر سکے اور کام و دہن کی معقول تواضع کر سکے۔ فائدہ یہ کہ مسافر میں تن آسانی پیدا نہیں ہوتی۔ ریاضت اور مجاہدے کے معنی سے آشنا ہو جاتا ہے۔ پیدل چلتا ہے اور بھوک رکھ کر کھاتا ہے (اگر کھاتا ہے تو) اس کا صحت پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے ہم بھی اپنے بدن کے ۲۰ پونڈ گھٹا کر لوٹے تھے۔ شاید یونیسکو کا منشا بھی یہی تھا۔ جو تا بھی ایک گھس گیا۔ دوسرا خریدنا پڑا۔ ایک بات ہے اب ان چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں نے جن میں بعض کے دوازے ادوائے سے کھلتے بند ہوتے تھے اور ان کے غسل خانوں نے ہمیں لکھنے کا مواد بہت کچھ دیا کیا۔

بارہ ولایتوں اور تسیس شہروں کا یہ سفر بہت سے اہل سفروں اور آوارگیوں کا نقطہ آغاز ثابت ہوا لیکن ان کی داستان طویل ہے اور چونکہ مشرق بعید امریکہ اور یورپ سب کو محیط ہے اس لئے اس کا نام جہنم دنیا کو مل ہے تجرذ کیا ہے یہ پڑھنے کے بعد جی چاہے تو اسے بھی پڑھیے۔

ابن انشا

۲۲ مئی ۱۹۷۱ء

اس کتاب کے کارٹون جمشید (جمشید انصاری) نے بنائے ہیں۔ البتہ پیرس کے باب میں کورٹونوں کے نیچے ساھ لکھا ہے وہ ڈیوڈ اینڈن کے ہیں غیر کارٹونی نقوش دوسری جگہ سے لئے گئے ہیں۔

ترتیب

پیرس ۰ یہ پیرس کا بروئل بازار ہے ۱۳۰
 آناٹاؤر بریگیڈ کا مرزا نسیم بیگ کے گھر ۱۹۰
 متفرقات پیرس ۲۹۰

لسدن لندن سے ایک خط ۳۷۰
 کچھ قصہ دہل چاقی کا ۵۱۰
 کچھ چکھوتیاں پھر کی ۵۸۰
 ٹاؤر سے نوم گھر تک ۶۵۰
 گھر سے دیکھے کالے دیکھے ۷۳۰
 بیان لذت آوارگی کا ۸۱۰
 نقاب عاشقاں سے لکھنؤ شریف تک ۸۸۰
 اے بھیرا! اے بھیرا! ۹۵۰

جرمنی

اب ہم فرٹیکرفٹ میں ہیں ۱۶۰

ہم جرمن زبان پر جاری ہو گئے ۱۱۰

کھانا ہمارا سیب ۱۱۹۰

آنا برلن اور ٹھہرا ہوٹل کفرستان میں ۱۲۳

برلن مارا اور منشی جی کا ۱۳۵۰

رائٹ برادران سے رجب علی سرور تک ۱۳۴

ہالینڈ

کوہ (ہومس) ابریز کی چوٹی پر ۱۵۵

ہالینڈ ہم کو پسند آیا ۱۶۱

ہالینڈ کے راستوں میں تنہا ۱۶۷

ہمیں بھی آرٹ سے رغبت ہے ۱۷۷

سوئٹزرلینڈ

ہوٹل ساں ساں ساں ۱۷۷

کھونا اکاڈنٹ سوئٹزرلینڈ میں ۱۹۳

ہم جینوا سے چل دیئے ۲۰۳

برن کی سحر بھری رات ۲۱۱

زلیورخ تک راستہ ٹھنڈہ ۲۱۵

شامت اعمال ماصورت پیرس گرفت ۲۲۹۰
 ڈوبی (موتل) کی ریس کون جیتا ۲۲۹۰

ویانا ہم ویانا پہنچتے ہی ڈی ویو ہو گئے ۲۳۵۰

قاہرہ دکھلائے سے جا کے تجھے مھر کا بازار ۲۳۵۰
 اہرام کے سائے میں ۲۶۵۰
 خان خلیل کی ایک شام ۲۷۳۰

لبنان و شام بیروت کی باتیں ۲۸۲۰
 دمشق میں عشق ۲۸۹۰
 ایک شام ہانسی کی محرابوں میں ۲۹۷۰
 جونیہ سے طرابلس تک ۳۰۵۰
 چل خسرو گھراپے ۳۱۳۰

پیرس

۶ ستمبر تا ۱۲ ستمبر ۱۹۶۷



یہ پیرس کا ہوٹل مالار ہے

یہ پیرس کا ہوٹل مالار ہے۔ اس وقت جبکہ ہماری جہاں گردی پر رشک کی نگاہ کرتے ولے کراچی میں اپنے خوانوں پر تر لٹے اڑا رہے ہوں گے، یہ آوارہ کوئے تباہ آوارہ تر بادا پنیر کے بد مزہ اور سخت سینڈ وچ کھا کر بیٹھا اور نمک سلیمانی پھانک رہا ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ پیرس جانے والا جاتے ہی پریوں کے جھرمٹ میں گھر جاتا ہے اور اس کا دن عید اور رات شب برات ہوتی ہے، انھیں یہ جان کر اطمینان ہونا چاہیے کہ ابھی ہم ٹن بھر کی گزشتہ کے آبلے پھوڑ کر بیٹھے ہیں، دل کے پھپھو لوں کی باری آتی معلوم نہیں ہوتی۔

ہوٹل مالار کو پیرس کا لمباری ہوٹل کہہ دیجئے تو مضائقہ نہیں۔ وہی ہیبت وہی شوکت، وہی شان و لارائی۔ یہاں ہمیں گھر کا سا آرام میسر ہے۔ اس کے غسل خانے میں ہمارے گھر کی طرح پانی کم کم آتا ہے۔ بلب کی روشنی خاص طور

پر اس لئے دھیمی رکھی گئی ہے کہ کوئی راتوں کو پڑھ پڑھ کر اپنی آنکھیں خراب نہ کرے۔ ہاتھ روم ایسی تنگنائے غزل ہے کہ ہم نے بازارہ کھول تو یا لیکن بدن پر صابن نہ لگ سکے، کیونکہ ہمارے قاریتین میں سے جو صاحبان کبھی نہلتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ صابن لگانے کے لئے کہنیوں اور گھٹنوں کو حرکت دینی پڑتی ہے اور اس حمام بادگرد کی دیواریں اس قسم کی عیاشی اور خوش فعلی کی گنجائش نہیں رکھتیں۔ ایک اور بات اس ہوٹل میں ہمارے گھر کی سی یہ ہے کہ یہاں کوئی ہماری بات سننا نہیں۔ سننا ہے تو سمجھتا نہیں۔ اور سمجھتا ہے تو جواب نہیں دیتا۔

ہمارا یورپ کا یہ پھیرا پورے چھ سال بعد پڑ رہا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ہی دن تھے بلکہ عجب اتفاق ہے کہ ستمبر کی پانچویں ہی تھی جب ہم نے کراچی سے اڑان کی۔ اس وقت بھی ہم چار روز کوپریس میں اترے تھے اور پریس کی دیدنی چیزیں دیکھ لی تھیں۔ لیکن اب تو ان کی ادیں ایک خواب کے سامان ہیں۔ آج شام ہم ایغل ہاؤس کی طرف جانکے تو پھر آسمان چھوٹنے کو جی چلا۔ لیکن فقط دوسرے ماٹے تک جا سکے۔ تیسرا کسی وجہ سے بند تھا۔ ۱۹۶۱ء میں یہ تنہائی کا عذاب نہ تھا ہم دو آدمی تھے۔ خریداری ہر چند کہ اس وقت بھی اسی طرح کرتے تھے کہ انجلی سے اسٹارڈ کیا۔ یہ یہ اور وہ۔ اس کے بعد مٹھی بھر پیسے نکال کر آگے کر دیے کہ سے لو جتنا جی چاہے۔ دو آدمیوں کے ہمہ وقت ساتھ رہنے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ کل ہمارے دوست ہاشم نے کہ سفارت خانے میں پریس آٹاشی ہو کر آئے ہیں ہمیں دال بجات کھلا دی تھی۔ لیکن پرسوں رات ہم پر عجب ماجرا گزرا۔ ہوا یہ کہ



سید ولی اللہ نے جو چھ سات سال سے پیرس میں ہیں ہمیں فون کیا کہ کھانا
 یہیں کھاؤ آج کی رات۔ میں آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تھیں ہونٹل سے آؤں گا۔
 ہمیں یہ بات کچھ پسند نہ آئی کہ وہ کھانا بھی کھاتے ہیں اور لینے بھی آتے ہیں۔
 عذر کرو یا کہ اس وقت ایک اور صاحب نے تحفہ کی دعوت کر رکھی ہے۔ میں
 جانا ہے۔ آپ کے ساتھ تو گھر کا سامنا ہے۔ پھر کبھی سہی۔ انھوں نے فرمایا:
 اچھی بات۔ میں مجبور نہیں کرتا۔

ہم نے شہر کا نقشہ ہاتھ میں لیا اور شانزائیزے کی راہ پکڑ لی۔ خاصا لمبا
 چکر پڑا اور محراب فتح تک پہنچتے پہنچتے کچھ سردی نے اور کچھ جھوک نے ہمارا کھانا
 شروع کیا۔ شانزائیزے پر کہ پیرس کی مال روڈ ہے، ہوٹلوں اور کیفوں کی کمی نہیں
 ہم نے ایک دو کو ٹھیک کر دیکھا۔ گائیڈ بک کے حوالے سے معلوم ہوا کہ وہاں
 ایک وقت کا کھانا سترے نوے فرانک تک قیمت پاتا ہے۔ سینڈویچ وغیرہ
 لے جا سکتے تھے لیکن ایک تو سوڈ کے قتلوں کا ڈر دوسرے جہاں نگاہ کی شراب
 کے شیشے تو ضرور نظر آئے، چائے کافی کا سامان دکھائی نہ دیا۔ یاد رہے کہ یہاں
 شراب پانی سے سستی ہے۔ سادہ پانی کی بوتل ایک روپے میں آتی ہے شراب
 کا جام چھ آنے آٹھ آنے میں۔ اپنی جیب کو دیکھتے ہوئے تو ہمیں نے ہی پینی
 چاہیے۔ لیکن عادت کا کیا کریں۔

قرض کا پیتے ہیں پانی پر سمجھتے ہیں کہ اں
 رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

خیراجی میں یہی ٹھانی کہ محراب فتح سے اپنے گھر کا رخ کرو اور لگی کے
 کونے پر جو کیفے ٹیریا ہے، وہاں سینڈوچ کھاؤ کافی پیو اور پیٹ پر ہاتھ
 پھرتے ہوئے سو جاؤ۔ سو اتفاق سے ہم راستہ بھول کر کیس کے کہیں جانے لگے
 اور اپنی گلی تک آتے آتے ساڑھے نو کا عمل ہو گیا۔ دیکھا کہ وہ کیفے بند ہے۔
 دور دور تک اور بھی کوئی دکان کھلی نظر نہ آئی۔ چند قدم پر ایک مٹھائی بسکٹوں
 والے کا اسٹور تھا۔ وہ بھی بند نکلا۔ ایک نمکڑ پر فقط ایک تبا کو سگرٹوں والے
 کا کیبن کھلا تھا۔ لیکن مالکولات میں سے کوئی چیز اس کے پاس بھی نظر نہ آئی۔
 اب بھوک خوب چمک گئی تھی اور اتنی لمبی کالی رات سامنے تھی۔ سو چاکہ ہوٹل کی
 خادمہ سے کیس لگے کہ بی بی ہمیں ایک کپ کافی کا بنا دو اور ہمارے تونڈے
 کے لئے جو ڈبل روٹی آئی ہوگی اس میں سے کچھ کھن یا جام کے ساتھ عنایت
 کرو۔ جان و مال کو دعائیں دیں گے۔ لیکن وہ عقیقہ اس وقت برتن اونڈھائے
 ٹیلی ویژن دیکھنے میں مصروف تھی۔ ہم نے کچھ دیر تو قف کیا کہ پروگرام ختم ہو
 لے، لیکن وہ تو کوئی لمبا ڈراما چل رہا تھا۔ ہم نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول
 کرنے کے لئے سلام بھی کھینچ مارا۔ اور یہ بھی کہا کہ ہمارے کمرے کی تہی خراب
 ہے۔ لیکن اس نے ٹیلی ویژن سے دھیان ہٹاتے بغیر علیکم السلام کہہ دیا اور
 یہ کہ تہی کی بات کل دیکھی جائے گی۔

اب ہم چھراپنے کمرے میں آئے اور کندھی لگا کر سوچنے لگے کہ کیا کھایا جائے
 شاید کوئی ٹافی وغیرہ کوٹ کی جیب میں ہو۔ نہیں۔ کوئی نہیں۔ پانی ضرور

دھرا ہے، لیکن وہ تو پانی ہے۔ ہم اپنے ساتھ کراچی سے اگر کھانے کی کوئی چیز لے کر چلے تھے تو وہ دوستیاں کارمینا کی تھیں اور ایک نمک سیلانی کی۔ دوستیاں کارمینا کی کھائیں لیکن وہ سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ اے کاش سلیم سعید نے بھوک بڑھانے کی بجائے بھوک مٹانے کی گولیاں بنائی ہوتیں۔

اب ہم بستر پر سیدھے بیٹھے ہیں اور سوچ رہے ہیں۔ کب صبح ہو اور ناشتہ ملے۔ لیکن ابھی تو دس بجے تھے۔ آخر یاد آیا کہ پی آئی اے والوں نے چھوٹا سا سونف کا ایک پکیٹ دیا تھا۔ کوئی تولہ بھر سونف اور دو تین دانے اس میں چھالیا کے۔ ڈھونڈنے پر نکل آیا۔ ہم نے اس پر دانت تیز کئے۔ سونف تو بجلتے خود اشتہا افزا ہے۔ لیکن چھالیا کام کی چیز نکلی۔ معدے نے درد کی دوا پائی۔ کچھ خلاء پانی سے پُر ہوا۔ اور پیٹ کے الاؤ کو دھیمہ کر کے ہم بستر میں گھس گئے۔

آنا فائر بریگیڈ کا مرزا نسیم بیگ کے گھر

ہمارے ہوٹل میں کوئی شخص انگریزی جانتا تو نہیں یہی حال ہماری فرانسیسی کا ہے کہ رفت گیا اور بود تھا سے آگے نہیں جاتی۔ پڑھنا تو اس زبان کا ایسا مشکل نہیں، لیکن ہونا؟ فرانسیسی میں سب سے مشکل مرحلہ یہی ہے۔ یہ ظالم لکھتے تو اسے سے زیر ملک بھی حروف ہیں لیکن بولنے میں ان میں سے دو تہائی کو پی جاتے ہیں۔ پیرس اُن کے ان پاری ہے اگرچہ بعضے بولنے میں اسے پغیہ بھی بنا دیتے ہیں۔ مشہور سر دک CHAMP ELYSEES کو آپ انگریزی میں شاید پڑھیں گے چیمپ الییزے۔ بلکہ یہ ہے شانز ایلیزے۔ جس کے سر راہ کیفوں میں سنا ہے جیل الدین عالی گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے اور دو جوں کے لیے مضمون اکٹھے کرتے تھے۔ ہماری مرغوب سڑک انگریزی کے قاعدے سے بووارڈ سینٹ نائیکل ہونی چاہئے۔

Boulevard

St. Michel - لیکن فرانسیسیوں کے نزدیک بووارڈ سال مثال ہے۔ ہم میٹرو یعنی زمین و ذریعہ میں سفر کرتے ہیں۔ ہمارا بتایا ہوا شیٹش لٹام کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آیا نہ کسی کا بتایا ہوا ہماری سمجھ میں آیا۔ لکھ کے بتاتے ہیں تو مخاطب کہتا ہے - اچھا



بارب زدہ کچھے ہیں نہ سمجھیں غم مری بات

یہ مطلب ہے 'تو میاں یوں کمونا'۔ تھک مار کے ہم نے زبان کا ٹٹا ہی ختم کر دیا ہے
 ممکن نہیں کہ شیخ امرا القیس بنیں۔ پنڈت جی بایک ہونے کے نہیں۔ رستر پوچھیں
 تو مہربان فریسیسی آدھا گھڑہلک عزن غاں کرتا ہے اور اپنی طرف سے وضاحت
 سے بھجاتا ہے۔ لیکن جبارے کام کی چیز فقط اس کی انگلی کا اشارہ ہوتا ہے ہم نے
 بھی اب اشاروں کی زبان پر ایسا عبور حاصل کر لیا ہے کہ رازی کے نکتہ ہائے وقت
 تک ان میں بیان کر سکتے ہیں لیکن کبھی کبھی اشارہ بھی رنجک چاٹ جاتا ہے ہم کل
 نیچے میٹر کے پیٹ فارم پر پہنچ کر ایک صاحب دل فریسیسی سے پوچھ بیٹھے کہ
 کیبروں کا سٹیشن جہاں ہمیں جانا ہے (انگل سے اشارہ کر کے) ادھر ہے یا ادھر ہے۔
 ایسا اکثر ہوا کہ ہمیں جانا مشرق کو ہے اور پہنچ گئے مغرب میں۔ اس بھلے مانس نے

ہمارے بار بار کے استفسار کے جواب میں اپنی انجلی سے برابر نیچے ہی اشارہ کیا، کہ
ادھر نہ ادھر بلکہ گاڑی یہیں آئے گی۔ ہم عاجز آکر وٹاں سے ٹھکسنے لگے تو ہمیں
پکڑ کر کھڑا ہو گیا، اور زبردستی اس گاڑی میں بٹھایا جو الٹی طرف کو جاتی تھی۔

ہمارے دوست ہاشم نے کہ فرانس میں تازہ دار و بے ساط ہوئے دل میں یہ نسخہ
دریافت کیا کہ منہ پورا کھول کر آواز نکالو، تب صحیح فرانسیسی بھجے گا، لیکن خود
ان کے ساتھ یہ گزر چکی ہے کہ ایک رستوران میں انھوں نے کسی چیز کا آرڈر دیا جو
تین فرانک کی تھی۔ پیرا اس نام سے ملتی جلتی دوسری چیز لے آیا جس کے انھیں کیس
فرانک دینے پڑے۔ ممکن ہے انھوں نے منہ پورے سے کم کھولا ہو یا زیادہ کھول
دیا ہو۔ بہر حال اب ان کا کہنا ہے کہ جب تک پوری طرح فرانسیسی پر عبور نہ حاصل کر
لوں۔ کم از کم خریداری میں فرانسیسی استعمال نہ کروں گا۔ ان کی یہ احتیاطیں سن کر
ہے۔ نیک دوست ہمارے انھی کے سے تیراکی کا شوق رکھتے تھے۔ لیکن کہتے تھے کہ
جب تک اچھی طرح تیرنا نہ سیکھ جاؤں پانی میں نہیں اتروں گا۔ چنانچہ نہیں اترے۔

جب ہم رات کو گھر یعنی ہوٹل کے کمرے میں آتے ہیں تو کوئٹر پر جو صاحب ہیں
ہمیں ضرور کچھ نہ کچھ (فرانسیسی میں) بتاتی ہیں کہ یہ فون آیا تھا۔ یہ پیغام ہے ہم شکریہ
ادا کر کے اوپر آ جاتے ہیں۔ انھوں نے پیغام دے دیا۔ ہم نے سن لیا۔ الامال انبیاء
ہمارے دوست مرزا نسیم بیگ یونیسکو میں تیرہ برس سے ہیں اور فرانسیسی
فرقہ دوست ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تم پر کیا گزرے گی جو مجھ پر شروع کے ایام میں گزری۔
ہم نے کہا۔ ارشاد! تب انھوں نے بیان کیا کہ میں نے مکان لیا تو گھر کے کام صفائی

دیگر کے لیے نوکرائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہاں کے نوکر بھی نواب ہوتے ہیں۔ لیکن بہر حال کسی نے بتایا کہ لگی کے کونے پر جو تبا کو فروش کی دکان ہے وہاں اپنا نام پتہ دے دو۔ ان کے پاس کوئی کام کی متلاشی آئے گی تو تمہارے پاس بھیج دیں گے۔ پس مرزا صاحب نے اپنی غوغاں کر کے تبا کو فروش کو فرمائش نوٹ لکرا دی اور اپنا پتہ دے دیا۔ آگے ان کی زبانی سنئے :

”تیسرے روز کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے کھولا تو دیکھا کہ ایک خاتون کھڑی ہیں۔ اچھی خاصی معترزہ لیکن کام کے اوقات کے باہر تو ہر کوئی شان کا لباس پہنتا ہے۔ کچھڑے قصائی تک سوٹ پہن کر صاحب بناور بن جاتے ہیں۔ میں نے انھیں عزت آور سے بٹھایا۔ ٹنگو شروع ہوئی انگریزی میں :

Speak English?
(انگریزی بولتے ہو؟) محترمہ نے پوچھا۔

Yes, speak English. (ہاں بولتا ہوں) میں نے کہا

Work? (کام؟)

Yes, work. (ہاں کام)

”کتنے گھنٹے؟“

”یہی چار پانچ گھنٹے“

”تخوہ؟“ ان محترمہ نے سوال کیا۔

”ہر جو عام طور پر ہوتی ہے۔ میں نے جواب دیا۔

”ہفتہ اتوار چھٹی؟“

”ہاں ہفتہ اتوار چھٹی“

”کب سے کام شروع کرنا ہے؟“

”جب سے آپ کا جی چاہے“

”آج ہی سے شروع ہو سکتا ہے؟“

”میں نے کہا۔ ہاں آج ہی سے شروع ہو سکتا ہے۔“

ان محترم نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اس پر اپنا پتہ لکھ کر کہا ”یہ لو“

اس پتے پر آجانا؟“

تب جا کر مجید کھڑا کہ وہ محترم خود ایک نوکر کی تلاش میں تھیں۔ تب کہ نوکریوں نے بتایا ہو گا کہ ایک صاحب آئے تھے کسی کام کی تلاش میں ہیں یہ رہا اُن کا پتہ۔ وہ بیچاری نوکر کے لیے ترسی ہوئی خود میرے غریب خلعے پر پہنچ گئیں۔

دوسرا واقعہ جو مرزا نسیم بیگ کے ساتھ گزرا، نسبتاً زیادہ سنگین تھا۔ ان دنوں یہ ۹۵ وکٹر ہو گیا وہ نیو پور پر رہتے تھے۔ ایک روز شام بیگم کے ساتھ باہر نکلے تو چابی اندر ہی بھول گئے۔ دروازہ اس قسم کا تھا جو بند تو خود بخود ہو جاتے ہیں لیکن کھلتے چابی سے ہیں۔ واپسی رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ہوئی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو چابی نہاد۔ کریں تو کیا کریں۔ نیچے ڈیوڑھی میں ایک بڑی بی رہتی تھیں۔ اُن سے عرض کیا۔ وہ تھوڑی بہت انگریزی جانتی تھیں سمجھ گئی اور ان کو مشورہ دیا کہ فائبر بیگیڈ کے دفتر جاؤ ان کے پاس بیس میٹریاں ہوتی ہیں ان کی مدد سے کوئی شخص باورچی خلعے کے روشندان میں سے گھس کر اندر سے کنڈی کھول دے گا۔ آسان سی بات ہے۔“

فائر بریگیڈ کا دفتر پھوٹاڑے ہی میں تھا، انھوں نے وہاں جا کر مافی الضمیر
 بھانے کی کوشش کی۔ ایک دو لفظ فریج کے کچھ انگریزی باقی اشاے وضاحت
 کے لیے چٹ پر گھر کا پتہ لکھا۔ ۹۵ دکنر ہیوگوا یونیورسٹی داروغہ صاحب نے اسے
 دیکھتے ہی سیٹی دی اور ایک بٹن دبایا۔ پھاٹک خود بخود کھل گیا اور دو فائر
 بریگیڈ کے انجن باہر نکل پڑے، فائر مین پہلی منزل پر چوکس بیٹھے تھے، ان کو حکم رہتا
 ہے کہ سیرجی یا لفٹ کا انتظار مت کرو، جونہی حکم ملے پانی کے پائپ سے پھسل
 کر نیچے آ جاؤ چنانچہ ایک کے بعد ایک نے نیچے اتارنا شروع کر دیا۔ مرزا صاحب
 کو صورت حال کا احساس ہوا بھاگے بھاگے ان کے پاس گئے ان کو ہاتھ کے
 اشارے سے روکا لیکن جس کو روکتے وہ ان کا ہاتھ ایک طرف ہٹا دیتا تھا۔ اور
 کتا۔ ۹۵ دکنر ہیوگوا یونیورسٹی یعنی یہ کہ تمہارے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہمیں گھر
 کا پتہ معلوم ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ انجنوں پر سوار گھنٹیاں گھنٹے بجاتے روانہ ہو گئے۔
 ان کے شور سے سارے محلے میں جاگ ہو گئی اور لوگ چونک کر کھڑکیوں میں سے بھاٹکنے
 لگے کہ کیا آفتا دآن پڑی۔ بعضوں نے فائر بریگیڈ دیکھ کر فرض کر لیا کہ آگ لگی ہے اور شور
 مچانا اور دھڑا دھڑا ہر چھانٹیں لگانا شروع کر دیا۔ ایک فائر مین نے ان کے فلیٹ
 کی کھڑکیوں پر پانی کا تڑیا بھی دینا شروع کیا اور دوسرا کھڑا لے کر اوپر چڑھ گیا لیکن
 آگ نہ دھواں کچھ ہوتا تو نظر آتا۔ جہوم میں ایک صاحب انگریز کا دان بھی تھے، ان
 کو مرزا صاحب نے بتایا کہ پانی اندر رہ گئی ہے فقط اس کو نکالنا ہے۔ لہذا ان سے
 کہئے کہ اتنے کھڑاگ کی ضرورت نہیں۔ فقط ایک آدمی اندر گھس کر دروازہ کھول دے
 بڑی مہربانی ہوئی۔ وہ لوگ جکتے جکتے چلے گئے اور رپورٹ کی کہ ان صاحب کے ہاں



تھا کیا جسے آگ لگتی۔ ناحق غلط اطلاع دے کر ہمارے کام کا نقصان کیا ہے۔ ان سے ہر جان لیا جائے۔ بڑی مشکل سے معاملہ رفع و دفع ہوا۔

ہماری گلی کے سرے پر ایک بہت پرانی بڑی ٹانگ تھی، اخباریوں صدی کے ادائوں کی کیسی امیر کی حویلی رہی ہوگی۔ اس کے چھانک پر ایک بورڈ ہم نے دیکھا
SORTIE DE VOITRES۔ ہم نے جی ہی جی میں فرانس والوں کی تعریف کی کہ اپنی تہیخی عمارتوں کا کتنا خیال کرتے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ نے بورڈ لگا دیا ہے کہ کوئی اسے گزند نہ پہنچائے۔ اس گلی میں آگے جا کر ایک اور عمارت کے چھانک پر بھی لکھا دیکھا۔ وہ بھی پرانی تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں۔ گویا محکمہ آثار قدیمہ نے تہہ کر لیا ہے کہ پیرس کی عمارتوں کی پرانی شان برقرار رکھی جائے۔ لیکن بڑی سڑک پر ہم مڑے تو ایک بالکل نئی عمارت کے ماتھے پر یہ بورڈ دیکھا۔ اب ہم حلقہ میں پڑ گئے کہ اس سے آثار قدیمہ والوں کا کیا تعلق؟ آخر ایک صاحب سے پوچھا۔ وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے یہ تو ہر دوسرے گھر کے چھانک پر لکھا ملے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہاں سے موٹر نہ لے لی۔ کوئی صاحب اپنی گاڑی سلنے کھڑی کر کے راستہ بند نہ کریں۔

DEFENCE D'AFFICHER ایک اور نوٹس ایک دیوار پر نظر آیا

آخری لفظ کا مطلب تو ہوا افریقہ اور ڈیفنس کا مطلب سب جانتے ہیں۔ ہمیں یاد آیا کہ الجزائر کی جنگ کے دنوں میں فرانسیسیوں کا جن جنگی طبقہ اس بات کے لیے مخابرہ کر رہا تھا کہ افریقہ کی حفاظت کو دینی حریت پسندوں کی شورش کو دباؤ۔ افریقہ پر

اپنا قبضہ برقرار رکھو۔ یہ نعرہ جو باجہا ہر سرحد پر لکھا نظر آیا۔ تو ایک فرینچ دان دست کے سامنے ہم نے سامراجی فرانسیسیوں کی ذہنیت کا ماتم کیا۔ اس نے کہا تمہارا جذبہ قابل تعریف ہے لیکن اس فقرے کا مطلب ہے ”میاں اشتہار لگانا منع ہے“ شانز ایوزے پر ایک جگہ بہت سی چمکیلی کاریں کھڑی نظر آئیں۔ اوپر موٹے لفظوں میں لکھا تھا OCCASIONS۔ ہم حیران کہ اس لفظ کے استعمال کا یہ کون سا موقع ہے۔ کئی دن کے بعد مجید کھن کہ اس کا مطلب ہے سیکنڈ ہینڈ۔ وہ ساری موٹریں سیکنڈ ہینڈ تھیں اور برائے فروخت تھیں۔ دم تحریر ہماری زبان دانی کی زمیل میں ہوں شور (صبح بخیر ملک دن بخیر) کے علاوہ جو الفاظ ہیں ان میں ایک SORTIE بھی ہے کیونکہ یہ ہر جگہ ہر عمارت میں زمین دوز ریوے کے سٹیشنوں پر سینماؤں میں عجائب گھروں میں لکھا رہتا ہے۔ اس کا مطلب ہے EXIT یعنی باہر جانے کا راستہ۔ ماتم نے کہا اسے مت بھولنا۔ بڑے کام کا لفظ ہے۔ کوئی اتنا دان پڑے تو کم از کم یہ تو جان لو گے کہ کدھر کو جانا ہے اور واقعی ہم SORTIE کے نشانوں کے ساتھ ساتھ چلتے ایک جگہ دم لینے کو روکے جگہ روکے گئے تب پتہ چلا کہ ہم فرانس کی حدود سے باہر آ گئے ہیں۔ ایک انگریز سا رجٹ ہمارا شانہ بٹا کر کہہ رہا تھا NO ENTRY۔ پہلے اپنا پاسپورٹ دکھاؤ، میاں جی۔



متفرقاتِ پیرس

پیرس میں جس روز ہم اترے، اسی روز جارجس نے نزولِ اجال کیا۔
 جانے کس نے موسم کو خبر کر دی تھی کہ ایک خوب الیاد ہلکا سوٹ پہن کر گھر سے
 نکلا ہے۔ خیمہ و خراہ بھی نہیں رکھتا۔ اس عروسِ ابلاد میں بلانے والے اسے
 چالیس فرانک (۱۰ روپے) روزانہ دیں گے اور بھولا ماینگ کیونکہ آنا تو اس کے
 ہوٹل کا کرایہ ہی ہے سسے نہ پتیا ہے نہ پینے کی استطاعت رکھتا ہے۔ پہلی ٹل
 گرم ضرور ہے بلکہ یوں کیئے کہ کبھی تھا کیونکہ وہ بھی لوگوں کی سرد مہریوں کے
 تھپڑے کھا کھا کر شیر گرم رہ گیا ہے۔ بقول انگلستان کے آغا حشر دیم شکسپیر کے:
 چل اسے ہوائے زمناں چل اور زور سے چل
 تو سرد مہری اجاب سے زیادہ نہیں

کہہ نہیں سکتے کہ پیرس کی کس بات پر ہمارا دل آیا۔ خواباں تو یہاں کے جیسے
 بھی ہوں۔ لیکن ہمیں سین کے ساحلوں کی آوارہ گردی۔ پرانی کتابوں نقشوں



انہ ہی جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیسا کیجئے

اور تصویروں کی سیر دیا، دکانوں کے ذخیرے اور شاہراہ ساں مشال ST. MICHAEL - کا ماحول خاص طور پر جھلے۔ درگاہوں کا ماحول ہم آپ جانتے ہیں کہ کیسا ہوتا ہے۔ جو استاد سخت گیر وارڈن - آپ منچے ہیں تو اونچی دیواریں چھانڈتے۔ گندی پھیلنے والی درخت..... لیکن سو رہوں کے

طالب علموں کو فرانس کی روایات آزادی سے سمجھنا وافر طلب ہے۔ ان طالب علموں

میں گورے بھی ہیں۔ کالے بھی۔ دیوار رنگ جو برطانیہ میں کم کم اور امریکہ میں
 بہت اونچی ہے۔ فرانس میں وجود نہیں رکھتی۔ کالوں کو دیکھا کہ شکس تو ہم ایسی
 لیکن نصیب سکندری۔ ہر زاغ کی چرنچ میں ایک ایک دو دو انگور۔ جوانی کی
 راتیں مراؤں کے دن۔ اے میاں کیوں اتنی دیر کر کے آتے۔ اب ہمیں ٹھونڈ
 چراغ رُخ زیبا ہے کر۔ یہاں کے لوگ بھی طالب علموں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے
 ہیں۔ اگر کسی ڈرامے یا شکر ٹکٹ دس یا بیس فرانک ہے تو طالب علم کا ایک فرانک
 بھی بہت جانا جاتا ہے۔ یہ بچارے بھی تھنڈا نہ زندگی کے عادی ہیں بھر چر سال مثال
 کے دو روپے سستے کیفوں کی قطاریں ہیں۔ طالب علموں کے غول باہر لگے ہوئے مینو
 پڑھ کر کم خرچ کھانوں کا انتخاب کرتے ہیں، بلکہ زیادہ تر تو چمچے اور پیٹ کے جھنجٹ
 میں نہیں پڑتے۔ اتھیں سینڈوچ ہے۔ جب ذرا گرون جھکائی کھایا۔ اس
 آڑوی اور شان تھنڈی کی توقع لندن، آکسفورڈ یا کیمبرج کے طالب علم نے رکھتے۔

حسن کی شوخیاں اور عشق کی گرمیاں یورپ کے لئے نئی بات نہیں۔ اب تو
 پروے پر پردا اٹھ رہا ہے۔ لیکن آنا ہم کہیں گے کہ پیرس میں لندن کا سا ابتذال
 نہیں۔ لندن میں تو سیدھی سادھی جسم فروشی ہوتی ہے۔ پیرس میں لب و لہار کی دعوتیں
 ضرور ہوتی ہیں :- ط

چھاتی سے لگا چوم لیا، ہو گئے چھکے
 لیکن غنڈہ گردی اور بیسواپن نہیں، عاشقی بھی سیتے کی اور فاسقی بھی سیتے کی۔

اُدھر تبار سے پیرس سے جانے کے دن قریب آتے جا رہے تھے یعنی گاؤں
کنارے بہا جا رہے، لہٰذا دیس بسانا ہو گا۔ اُدھر پیرس سے محبت بڑھتی جا رہی ہے
خود بخود دل میں ہے یہ شہر سما یا جاتا
شہر تو ہم نے اور بھی دیکھے ہیں لیکن جو بات پیرس کی ہے وہ اور کہاں

ہے ہوا میں شہاب کی تاثیر

زبان نہیں آتی۔ بجلی سے نہ آئے۔ آخر گزارہ چل ہی رہا ہے۔ چھ سال پہلے
ہم نے پیرس قطعی مسافرانہ یعنی سیاحتانہ دیکھا تھا۔ ایک ٹورسٹ بس میں بیٹھ گئے
تھے اور اس نے شہر میں گھمادیا تھا کہ یہ نوپور کا مقبرہ ہے۔ یہ محراب فتح ہے۔ یہ
نوتری ڈیم کا گرجا ہے۔ اور وہ لاؤور کے دو دیوار ہیں۔ دوسرے دیکھ لو۔ پھر نہ
کنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ یہ تو کچھ دیکھنا نہ ہوا۔ اس بار ہم نے اپنے شوق کو بھر بنایا
اور اپنی ٹانگوں کی سواری پسند لی۔ نوتری ڈیم یا نوتری داسے کو جی بھر کے
فرصت سے دیکھا۔ مذہبی سردس میں بھی پھلی پنچوں پر بیٹھے اور اس کی عظمت و
جہرت کا نقش دل پر لے کر آ گئے۔ پیرس میں یہ سب سے محترم عبادت گاہ ہے
لیکن ہم تو اسے دکڑ ہو گئے اور اس کے نادل نوتری ڈیم کا کپڑا کے حوالے سے جانتے
ہیں۔ یہاں ایک زمانے میں جیو میٹر کا مندر ہوا کرتا تھا اس کی جگہ بارہویں اور چودھویں
صدی عیسوی کے درمیان یہ گرجا تعمیر ہوا۔ ذرا اس کی رفعت کو دیکھئے۔ اور وسعت
کو دیکھئے۔ اس کی پیشانی کے مجسموں کو دیکھئے۔ اس کی رنگین منقش کھڑکیوں کو دیکھئے
بند و بالا ستونوں اور مخروطی چھت کی زیبائش پر نظر کیجئے۔ جانے کتنے برس اس



ٹورسٹ کا مطلب ہے امریکن ٹورسٹ

کام میں لگے ہوں گے ۔

فرانسیسی لوگ اپنی زبان پر ایسا فخر کرتے ہیں کہ شاذ و نادر ہی کہیں انگریزی کا کوئی ٹوٹا ہوا ہے۔ لیکن نوٹرے ڈیم کے دروازے کے پاس جو ٹوٹا ہوا ہے، وہ انگریزی میں ہے ۔

” یہ میوزیم نہیں ہے۔ خانہ خدا ہے۔ یہاں ڈھنگ کا لباس پہن کر آؤ۔ اسے کیسل کا میدان یا ساحل بحر مت تصور کرو کہ کچھ پینا پینا نہ پینا نہ پینا —“

مجھے سے پتہ چل جاتا ہے کہ خطاب دنیا کی سب سے امیر لیکن نو دوستی قوم امریکہ سے ہے۔ یا پھر ایک تحریر یونیورسٹی کے کی ایک دیوار پر انگریزی میں نظر آئی :-

U.S. GO HOME

لندن

۱۳۱ ستمبر تا ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۷ء



لندن سے ایک خط

عالی میاں !

یہ لندن ہے اور لندن میں مسز واٹسن کا بھتیخا خانہ موسوم بہ گلوٹر ہوئی۔ اس وقت میں کمرہ نمبر ۷ سے جو تہ خانے میں رشک کے رخ واقع ہے اور جس کی کھڑکی کے باہر کوڑے کا ڈھم نظر آ رہا ہے، یہ نامہ شوق آپ کی خدمت میں لکھ رہا ہوں۔ میرا قریبی داستان گو نے کسی غریب مسافر کے سرائے میں جانے اور بھتیخاؤں سے پالا پڑنے کا حال اپنی داستانِ بولی میں لکھا ہے، اس وقت یاد آگیا۔ بیکس نہیں۔ یہاں اتنی زدہ کیفیت بھی نہیں۔ ہاتھی لٹے گا بھی تو کہاں تک۔ یہ سچ ہے کہ وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں۔ یعنی یہ کمرہ وہ نہیں جس کی بکنگ میں نے کراچی ہی سے خط لکھ کے کرائی تھی۔ بے مبر مسز واٹسن نے وہ کسی اور گاہک کو دے دیا۔ اور دیکھا مجھے تو چھوڑ دینے مسکرا کے ہاتھ۔ یعنی میرا منہ تکٹنے لگیں کہ آپ تو سچ بچ آ گئے۔ میں نے کہا، ہم باہر خاطر ہوں تو کہیں اور ٹھکانا کریں، شبِ ہاشی کا بہانہ کریں۔ سوچ کر بولیں، ابی نہیں شہرینے کوئی بندوبست کرتی ہوں۔ میری خاطر ان کو اتنی منظور ہوئی کہ اس کمرے سے فوراً ان میری کوکلات مار کر نکال دیا۔ میں نے کہا۔ یہ کیا کیا؟ اس

بھاری کولیوں نکالا مجھے کیوں اور جگہ مل جائے گی۔ بولی، اجی صاحب آپ پروا نہ کیجئے۔
 رقیق القلب نہ بنیئے۔ آپ میرے لئے زیادہ اہم ہیں۔ بزنس اڈبزنس اس کا کیا ہے پُند
 دن میں دو ٹکے کھا کر چھرا جاتے گی۔ کبھی بار چاکلی ہے اور آپ چکی ہے۔ ہاں تو لایئے ایک ہفتہ
 کا کرایہ پیشگی۔ آٹھ پونڈ تہ آپ نے لندن میں ایٹیاٹیوں سے نسلی آتیاز برتے جانے کی داستانیں
 سنی ہوں گی اور خبریں دیکھی ہوں گی، لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ مسز داٹس نے میری خاطر اپنی ایک جھوٹن
 کو بچا لیا۔..... ہاں آٹھ پونڈ کی بات ابتر ہے۔ رنگ و نسل اپنی جگہ، پیسہ اپنی جگہ۔

لندن بالکل ویسا ہی ہے جیسا میں چھ سال پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ اتفاقات سنو کہ ۱۹۶۱ء میں
 بھی ۵ دسمبر کو جل کر ۱۲ دسمبر کو وارڈ لندن ہوا تھا۔ اب کے بھی ۵ دسمبر کو چلا اور ایک ہفتہ راستے میں
 گزار کر ۱۲ دسمبر کو مایاں پہنچا۔ اُس سال بھی ان تاریخوں کو منگل کا دن پڑتا تھا۔ اب کے بھی منگل ہی کا
 ساتھ ہے۔ پیر میں بازار ہوئی میں میرے کمرے کا نمبر، اتھا۔ یہاں بھی، اے۔ یہاں میں شام
 کے جھٹ پئے میں پہنچا لیکن ہر چیز کچھ مانوس مانوس معلوم ہوئی۔ صبح دم دیکھتا ہوں کہ یہ تو کونیز
 گارڈن کے بالکل ساتھ والی گلی ہے۔ کونیز گارڈن وہ جگہ ہے جہاں میں اُس سال ٹھہرا تھا۔ فقط
 ٹھہرا ہی نہیں تھا۔ حضرت قوت نادوی کے مصرع کی پوری واردات ہوئی تھی۔ ۵
 کو اُس نے جایا، جا کر بٹایا، بٹا کر اٹھایا، اٹھا کر نکالا

آپ کو یاد ہوگا اس سال میرے ساتھ اپنے بنگال شاعر ابو العین بھی تھے۔ ہم دونوں ٹیم کا میل
 جھٹاکر بیان آگئے اور سید الطھر علی کی مہرانی سے کونیز گارڈن کے نمبر ۵۰ میں ۳ نمبر کا کمرہ مل گیا تھا
 جہاں پروگرام لندن میں فقط آٹھ دس روزہ کئے کا تھا لیکن ہوتے ہوتے پانچ چھ گزر گئے حتیٰ کہ

یاد آشنا پوچھنے گئے کہ میاں ابھی گئے نہیں؟ کب جاؤ گے؟ بی بی سی کے دوستوں نے ہم سے تقریریں لکھوانا اور نظمیں پڑھوانا بھی بند کر دیا۔ لندن میں دیکھنے کے قحطیات بھی ختم ہو گئے۔ ہمارا غیر ملکی ذریعہ بار کا تو لندن ہی خاصہ گڑا گیا تھا اور ہمارے مالک مکان نے بھی مصنوعی اندام پر موقوف کر دیا تھا۔ اس کے باوجود ہم لندن میں تھے۔ محض ابو الحسین صاحب کی پراسرار بیماری کی وجہ سے ابو الحسین نے لندن چھپتے ہی ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کے پتے پوچھنے شروع کر دیئے تھے۔ ایک روز ہم نے گفتگو میں ڈاکٹر گراہم ہیل کا ذکر کیا تو بوسے، کس چیز کا ڈاکٹر ہے۔ بوسے اس کے پاس بے چلونا، ہم نے کہا اول تو وہ سانیات کا ڈاکٹر ہے اور تمہاری بیماری اس سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے بقیہ حیات نہیں ہے۔ اس پر انہوں نے دوسرے دوستوں سے رجوع کرنا شروع کیا۔ خصوصاً لندن میں رہنے والے بنگالیوں سے ہمیں ذہن کے مرض کی نوعیت معلوم تھی نہ ہم نے اس کے متعلق استفسار کرنا مناسب جانا تھا کہ جانے کونسی اور کیسی بیماری جو جس کے ذکر سے وہ آپ بھی شرمسار ہوں، اور میں بھی شرمسار کریں۔ لیکن جب آٹھ روز گزر گئے اور ہم نے لندن سے آگے چلنے کو کہا تو ابو الحسین بوسے: میاں تم چاہو تو جاؤ نہیں چند دن اور لندن میں رہو گا۔ علاج کر لے جاؤ گا۔ آخر ہم نے معافی چاہ کر پوچھ ہی لیا کہ مرض ہے کیا؟

بوسے: یہ پرانا مرض ہے۔ پاکستان میں اس کا بہت علاج کرا چکا ہوں لیکن نہیں جاتا۔ پاکستان کے ڈاکٹر، جلیلم، دید، ایمر، ستیجے، ہرمیو، ستیجے، فٹ، پاتھینے سب دیکھ لئے ہیں تو لندن آیا اسی کارلن ہوں۔ شاعری کا سہلہ تو بانا تھا۔

ہم نے کہا: کچھ مرض کی تفصیل تو بیان ہو۔

بوسے: جس روز دفتر میں مجھے آٹھ دس گھنٹے مسلسل کرسی پر بیٹھا پڑے تو پیشاب



درد ہونے لگا ہے :

”معمول یا شدید ؟“

”نہیں شدید تو نہیں ہوتا۔ میٹھا میٹھا ہلکا ہلکا“

”اور وہ مستقل رہتا ہے ؟“

”نہیں۔ پانچ سات منٹ میں جاتا رہتا ہے“

”ہر روز ہوجاتا ہے ؟“

”نہیں بلکہ جس روز آٹھ دس گھنٹے مسلسل بیٹھا پڑے“

ہم نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔ بہت سنگین مرض معلوم ہوتا ہے۔ ہم کے
علاج کراؤ۔ ماش کرائی ہے ؟

”کرائی“

”جو شانہ پیا ؟“

”پیا“

”ٹیکے لگوائے ؟“

”لگوائے“

”طاقت کی دوائیں کھائیں ؟“

”کھائیں“

”گندھے قویذ کئے ؟“

”کئے“

”آپریشن کرایا ؟“

”کس چیز کا؟“

دماغ کا، اور کسا؟ جیسے مانس کیوں ڈاکٹروں کو پریشان کرتے ہو۔ نعمان کے پاس گئے ہوتے لیکن تمہارے مرض کی دوا شاید اس کے پاس بھی نہ ہو۔ یہ مرض لاعلاج ہے۔ اب اپنی زندگی کے باقی دن جوں توں پورے کرو۔

ابوالحسین صاحب نے تو نہایت وسیع قلبی سے اجازت دیدی کہ تم چاہو تو جاؤ لیکن یورپ کے کئی ملکوں کا پروگرام باقی تھا اور تنہا آدمی سفر میں نہ چل سکتا ہے۔ وہ ہوں تو آپس میں دُکھ سکھ سہیتے ہیں۔ ایک کمرہ بے لینا سستا پڑتا ہے۔ سواری بھی جیسے ایک نے لی دو نے لی، کئی بار ایک کو مسلمان کے پاس پھوڑ کر دوسرے کو کوئی اور امر دیکھنا ہوتا ہے۔ بہر حال پردیس میں ساتھی بہت نفیست ہے خواہ وہ ابوالحسین کا سا ہی کیوں نہ ہو آخر یہی سوچا کہ جن لوگوں سے رخصت ہوا آئے ہیں کہ جیسا چاہا رہا ہوں۔ ان کے سامنے نہ جائیں گے اور لندن کے گلی کوچوں کا گشت جاری رکھیں گے۔

خیر تو اب قصہ غلو سے آدم کے نکلنے کا سینے؛

وہ رات بڑی سہانی رات تھی۔ ابوالحسین اس روز اپنے ایک دوست کے ان دعوتے اور انھیں سونا بھی دیں تھا۔ ہم نے مڑے مڑے سے ڈھائی شلنگ والا سینما دیکھا، اور زمین دوز ریل پر ڈکوٹرز سے اسٹیشن پر نکل آئے بھوک لگ رہی تھی۔ کسی اور کھانے کا اس وقت سوال نہ تھا، کوٹرز سے کے ایک کونے سے دھپی بے لی، گراپی میں ریو سینما کے آگے اور دیگر مقامات پر بھی آپ دیکھیں گے کہ بھینس کے موٹے قیسے کے شامی کباب کھانے والے بیٹھے رہتے ہیں آپ

پہنچے، انھوں نے ایک چھوٹی ڈبل روٹی یعنی بن کا پیٹ چاک کیا، اس میں ایک کباب مع تھوڑے پایز چٹنی کے رکھا اور آپ کو تمنا یا، جہاں خدا جائے اس کا کیا نام ہے، لندن میں ہو تو وہی نام پاتے۔ اور دو ڈھائی روپے میں بکے، خیر وہی بے، سامنے کی خود کار مشین میں چھ پنس ڈال دو دو کا شند اٹھاں برآمد کیا اور ایک ہاتھ میں یہ ایک میں روئے، کچھ لٹکتا تے، سیٹی بجاتے گھر کا رخ کیا۔

پاسبان دروازے کے باہر ہی کھڑا تھا، اس نے کچھ کھنے کی کوشش کی، ہم نے تصور سے چچا کو سلام کر دیا ہے، خیرت پوچھ رہا ہے۔ لہذا نہایت خوش دلی سے اس کی بھی خیریت پوچھی اور موسم کی خوشگوار سی بھی مطلع کیا، لیکن اندر بیڑیاں چڑھنے سے پہلے ایک دم کو ٹھٹھکے، وہاں ایک اور رکٹ زمین پر پڑا تھا، بالکل ہمارے اور کوٹ کا ہم شکل۔ خود سے دیکھا تو ایک سوٹ کیس نظر آیا۔ یہ بھی اتفاق سے، میں ہمارے سوٹ کیس کے ناک نقشے کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک تھیلہ ابولمیں کے تھیلے کے مشابہ نظر آیا اور کتابوں کا ایک ڈھیر اتفاق کیے کہ ان کتابوں میں سے بھی بھی ہمارے پاس اور پر کمرے میں موجود تھیں، قیضیں نمایاں و غیرہ بھی ایک دوسرے پر ڈھیر لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ دوسرے توجہ دیتے اور یوں بھی ان چیزوں سے ہمارا تعلق تھا، خیر ہم اور پر کمرہ نمبر ۳ یعنی اپنے غریب خلعے پر پہنچے۔ اور دروازے میں کبھی گھمائی، کیا دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب کھڑے ہیں بیلڈنگ سوٹ پہنے درشتی سے بولے :

”کیا چاہتے ہو؟“

ہم نے کہا : یہ ہمارا کمرہ ہے، آپ یہاں کہاں؟

انھوں نے کہا : یہ آج سے ہمارا ہے، ہم نے کرایہ دیا ہے، پوچھ لو پاسبان سے :

اتنے میں پاسبان بھی آن موجود ہوا تھا۔ اس نے بھی سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک کر تصدیق کی اور کہا: ”جی ہاں آپ کی میعاد ختم ہوئی، اب یہ ابن کا ہے۔“
 ”لیکن تمہیں کیا سچی ہے ہمارا کمرہ کسی کو دینے کا۔“

اس نے کہا: ”جناب حسب قاعدہ آپ کو میعاد ختم ہونے سے دو دن پہلے مطلع کرنا چاہئے تھا کہ آپ اگلے ہفتے بھی اس میں فردکش رہیں گے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آپ کمرے کمرے خالی کر دیں اور ہمیں کرایہ دار کے انتظار میں جھینکن پڑے۔“

ہم نے کہا: ”تم ہم سے پورے ہفتے کا یعنی پیر تا اتوار کا کرایہ وصول کر سکتے تھے لیکن یوں ہمیں کمرے سے بے دخل کرنے کا اختیار نہ تھا۔“

پاسبان یا نگران جو بھی کچھ اُسے کیئے مانا کارہنے والا تھا۔ اور مانا کے رہنے والے پاکستانیوں، ہندوستانیوں سے یوں بھی خار کھاتے ہیں۔

اس نے کہا: ”جناب پھر آپ ایسے لوگ ہی جھگڑا کرتے ہیں کہ پورے ہفتے کا کرایہ نہیں دیں گے۔ آپ کو کمرہ مطلوب تھا تو دو روز پہلے نہ کہہ سکتے تھے۔“

یہ بات سچ تھی مگر ہمارا تصور زیادہ نہ تھا۔ ابوالحسن اپنی بیماری کے کارن لندن سے اپنی روانگی ہر روز ملتوی کرتے تھے اور ہم روز کو پن ہیگن کی سیٹ کینسل کرتے تھے۔ اب کے خیال تھا کہ مجھے یا ہفتے۔۔۔ حد سے حد اتوار کو، ہم کمرہ اور لندن چھوڑ دو انہ ہو جائیں گے لیکن وہ نہ ہوا۔ یہ ہمارے گمان میں بھی نہ تھا کہ مالک کسی اور کرایہ دار کو لے آئے گا۔

ہم نے کہا: ”اچھا ہمیں کوئی اور کمرہ دے دو۔“

انہوں نے کہا: ”بالکل نہیں ہے کمرہ ہمارے ہاں۔“

ہم نے بہت کہا کہ ہم تمہارے پرانے اور مستقل گاہک ہیں۔ چار ہفتے سے یہاں مقیم ہیں۔

ہم سے یہ بے رحمی نہ برتو — لیکن وہ خدا کا بندہ نہ پسچا۔ بولا، کہیں اور ڈھونڈ دیتے۔ یہاں اب آپ کو کمرہ ملنے سے رہا۔

ہم نے کہا، میاں ہمارا سامان تو کمرے ہی میں ہے۔ اسے تو نکال لیں۔

بولا، جناب کمرے میں نہیں، نیچے میٹریسوں کے پاس فرش پر ہم نے ڈھیر کر دیا ہے اسے فوراً اٹھو لنے۔ ورنہ ہم کسی چیز کی گدی مٹی کے ذمہ دار نہیں ہوں گے۔

یہ وقت کوئی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے رات کا تھا۔ اور اس غلغلا کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم تنہا تھے۔ ممکن ہے اتھا پانی تک نوبت پہنچتی، لیکن ہم نے دیکھا کہ اتھہ ہمارے خالی نہیں ایک میں دھپی تھی، ایک میں دودھ کی بوتلی۔ یہ چیزیں کمرے میں بیٹھ کر گندی لگا کر کھانے کی تھیں، لیکن اس بے سرو سامانی میں ان کا کیا کریں؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پاسان سے کہا کہ بیٹا ایک دو گھنٹے ہمارے سامان پر نظر رکھو، ہم کوئی اور کمرہ تلاش کر لیں تو آٹھائیں۔ وہ کچھ نہ بولا۔ کم از کم معترض نہ ہوا۔

گلی میں غل کر ہم کو سب سے پہلے اتھہ خالی کرنے کی فکر ہوئی، فٹ پاتھ پر بیٹھ کر تو کچھ نہ دکھایا جاسکتا تھا۔ چلتے چلتے بھی کسنا ممکن نہ تھا۔ ممکن ہوتا تو غلاب تمذیب ہوتا۔ دو گلیاں چھوڑ کر گلی میں کچھ کاریں پارک تھیں۔ ہم نے ان کی اوٹ میں جا کر جلدی جلدی دھپی کے چمچے کاٹنے اور پھر غٹ فٹ دودھ پی گئے۔

پہلی بات ہی سمجھ میں آئی کہ سید لعل علی سے استمداد کریں۔ کم از کم یہ رات اس کے کمرے کے فرش پر کاشیں کل مکان کاٹش کریں گے۔ اس کا ٹھکانہ ہی دُور تھا۔ گھنٹی بجانی نہ صدائے برخواست۔ گویا صوف ابھی باہر سے تشریف نہ لائے تھے۔ کچھ گھنٹہ اور اُدھر گھوم کر پھر گھنٹی

جا بھائی۔ پھر کوئی جواب نہ آیا۔ اب کے ہم نے دوسری گھنٹی بجا کر لیڈ فیڈ کی خاموشی کو بھایا۔ وہ
جھپکی جھپکتی برآمد ہوئیں اور کہا، کیا بات ہے جی؟

ہم نے کہا، آٹھر کو پوچھتے ہیں۔

بولیں، پھر ان کی گھنٹی بجائے۔ مجھے یوں تنگ کرتے ہو۔

ہم نے کہا، وہ تو ہے نہیں۔ اجازت ہو تو یہاں ڈیوڑھی میں بیٹھے کے انتظار کریں۔

باہر سر دھکی جا رہی ہے۔

بولیں، بالکل نہیں۔ آپ باہر چلیے۔ میں پاکستانیوں کو خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔ بہت
بے ڈھب اور بد معاملہ لوگ ہوتے ہیں۔ آٹھر آجائے تو اس کے ساتھ آڈر آسکتے ہو۔ لیکن اس
کے کمرے میں سونے کی کوشش پھر بھی نہ کرنا۔

ہم نے جوابت سے کہا، آج کی رات ہم بے خانہاں ہیں۔ اچھا یہ اجازت دو کہ یہ رقعہ
ان کے کمرے میں ڈال آئیں۔ اس کی انھوں نے ازراہ غایت اجازت سے دی۔ اور ہم نے
احوال اپنی بے دخلی کا رقم کر کے رقعہ آٹھر کے کمرے میں چھینک دیا۔

باہر نکل کر ہم نے دیکھا کہ سامنے ہی ہوٹل ہے۔ نام اب اس کا یاد نہیں۔ گھنٹی بجائی تو ایک
جلی گئی جہیں ہمیں بڑیا براؤں ہوئیں بولیں،... یہ کیا وقت ہے شریف آدمیوں کو تنگ کرنے کا؟
ہم نے عمر صبر کی عاجزی اپنے لیے میں سو کر کہا کہ ہم اس وقت بے ٹھکانہ ہیں۔ آدمی شب
کا عالم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سوئیں۔ پھر آخر آپ کی عدالت مشترکہ کے آدمی ہیں۔

بولیں، میں نے کوئی ٹیکہ لے رکھا ہے۔ جاؤ جھلے آدمیوں کو بے وقت پریشان نہیں
کرتے۔ نہیں ہے جگہ میرے ہاں؟

ایک اور ہوٹل میں پوچھا، وہاں بھی یہی جواب ملا۔

ایک فون سے قری ہوئے سے بات کی۔ میمنجر نے کہا۔ ہمارے ہاں جگہ ہے۔ تشریف لے آئیے۔ جب ہم خوش خوش واپس پہنچے تو میمنجر ہماری جگہ کی رنگت دیکھ کر بہت گھبراہٹ ہو گیا۔
 بجناب جگہ تو باطل نہیں۔

ہم نے کہا دس منٹ پہلے تم نے کہا تھا کہ ہے ۔
 بولا جی ہاں ! لیکن اس عرصے میں وہ رگ گئی ۔ معافی چاہتا ہوں ۔
 یہ کہہ کر بڑے زور سے دروازہ بند کیا ۔

اب کوئی عالم ایک بجے کا ہو گا۔ ہم نے سوچا اب دیکھیں اظہر آیا ہے کہ نہیں گھنٹی بجائی۔
 اظہر صاحب برآمد ہوئے۔ ہم نے کہا۔ تم نے میرا رتھ نہیں دیکھا تھا؟ مدد کو کیوں نہیں آئے؟
 بولے۔ اب تمہارے گھنٹی بجانے پر دیکھا ہے ورنہ یہی خیال کیا کہ یونی کوئی کاغذ ہو گا۔
 اب میری میڈیٹیشن تو بہت سخت ہے تمہیں میرے کمرے میں گھنٹے نہیں دے گی لکھیں اور
 تلاش کریں۔

اب ہم دونوں نے ایک دوجے کو کشش کی۔ لیکن ناکام۔ آخر انہوں نے کہا۔ یہ سائے
 وائے ملکان کے پاس ان سے ایک سیلک ہے اور چونکہ میں یہاں کئی مہینوں سے رہتا ہوں شاید
 کام بن جائے۔

ہم نے کہا۔ ہم دیکھ چکے۔ ان کے ہاں بھی مطلق جگہ نہیں۔
 اس کے باوجود ہم نے واپس جا کے دستک دی۔ پاسان صاحب نکلیے۔ بولے جگہ باطل
 نہیں۔ میں ان صاحب کو پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ اب اظہر نے ان کی خوشامد کی۔ اپنی ہمایوں کی اور
 ہماری بہ عالی کا ذکر کیا اور کہا۔ فقط آج رات کی بات ہے کل یہ انتظام کر لیں گے۔

اس مرد شریف نے کیا، بچے تو خانے میں خادمہ کا کمرہ ہے اس میں یہ رات کاٹ لیں۔
کرایہ سوا پونڈ ہوگا۔ لیکن علی صبح کمرہ خالی کر کے سامان دفتر میں جمع کراویں اور گیارہ بار بجے
تک اٹھو لے جائیں۔

ہم نے اور اٹھنے ان کی انسان دوستی اور نیکی کا صدق دل سے شکریہ ادا کیا اور
دونوں مل کر سامان ڈھویا۔ تین پھرے ہوئے۔ اٹھ سے معذرت کی کہ مجالی تمہیں بے حد
تحلیف دی۔ خدا کا شکر کیا کہ چھت تو نصیب ہوئی۔

ارے بھئی یہ خط تو لندہ نور بن سعدان کی داستان بن گیا۔ ہم لکھیں اور پڑھا کرے کوئی۔
سالانہ مذکور صرف اس کمرے کا تھا۔ کچھ ایسا بُرا نہیں غسل خانے کمرے میں نہیں لیکن کچھ دور بھی
نہیں۔ چوہا کمرے کے کونے ہی میں ہے۔ واش بین بھی جس میں سے اس وقت بھی ٹپ ٹپ
کی مڑی صدا کر رہی ہے۔ پانی قطرہ قطرہ گرا رہا ہے کیونکہ ٹی پوری طرح بند نہیں ہوتا۔ کوسٹرز
گھر ڈن کے جس مکان کا قصہ میں نے چھلایا ہے وہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ لو اس کے تعلق سے
ایک اور قصہ سنو۔ نمبر ۵ کوسٹرز گھر ڈن میں کل چھ سات کمرے ہوں گے۔ ہمارا کمرہ پہلی منزل پر
تھا غسل خانہ بچے گراؤنڈ فلور پر۔ اس غسل خانے کے ساتھ ایک کمرہ ڈانس کیپر کا اور ایک میں
ایک طرحہ لار اور طرار صاحبہ۔ وہ کیا کرتی تھیں۔ کیا کماتی کماتی تھیں؟ یہ معلوم نہیں۔ ماں ایک بار ڈنر
دوسے مالک مکان کے گشتہ کے ساتھ لڑائی دیکھی گئی تھیں کہ تم لوگ مجھے بدنام کرتے ہو، جانے
کیا بھتے ہو؟ خیر۔ ایک روز بوقت نیم شب اپنے کمرے سے بچے غسل خانے میں جانے کے
لئے زینہ زینہ اتر رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کوئی نیم تاریک کاریڈور میں صدور واڑے سے
شاکر ہے۔ آواز دی کون ہے؟ یہ وہی صاحبہ تھیں۔

زینے کے قریب آئیں تو دیکھا کہ پتے ہوتے ہیں۔ لہذا لٹکھڑا رہی ہیں اور زمیں ٹکریٹ
 ہے۔ بولیں: آپ کے پاس ماچس ہے؟
 ہم نے کہا: سوری! نہیں ہے۔
 وہ پھر بولیں: جناب میں ماچس مانگ رہی ہوں۔
 ہم نے ذرا وضاحت سے کہا:
 - نہیں ہے ماچس ہمارے پاس۔ کیونکہ ہم ٹکریٹ نہیں پتے، یہ کہہ کر غصہ خانہ میں
 چلے گئے۔

غصہ خانہ میں آدھ گھنٹہ تو رکا ہوگا۔ باہر نکل کر دیکھا کہ وہ وہیں کھڑی ہیں۔ بولیں:
 "پلیز — مجھے ماچس ضرور چاہیے"
 ہمیں احساس ہوا کہ یہ چارہ لکھنی ضرورت مند ہے۔ اس کے ساتھ ہی یاد آیا کہ بڑے سے
 ایک ماچس بطور سوینر خریدی تھی۔ ہم نے کہا آپ یہیں ٹھہریے، میں اپنے سامان میں تلاش
 کرتا ہوں۔

بولیں، میں آؤں تلاش میں مدد دوں۔
 ہم نے کہا: "نہیں آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں، یہیں ٹھہریے۔"
 اوپر ابوالحسن تو سوتے ہوئے تھے۔ ہم نے سوٹ کیس کے ایک کونے میں ماچس دریافت
 کر لی۔ اور نیچے آکر اُن صاحب کو تھا کے لئے پاؤں میسر میاں چڑھنے لگے۔ ہمیں تعجب تھا
 کہ انہوں نے شکریہ تک ادا نہ کیا۔ جھوٹکی کھڑی رہیں۔ خیر ایسا جوتا ہی ہے ہم اوپر لگے سوئے۔

دوسرے روز بی بی سی میں اپنے دوستوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو ان کو بیٹھ علی گار۔

پہلے تو خود چنبھے۔ پھر جو بھی مٹا اس کو سنو اتنے کہ سنو رات انشا صاحب کے ساتھ کیا ہوا۔ انی
سے کلامات ماچس مانگی گئی تھی۔ آخر ہم نے پاکستانی سیکشن کی سیکرٹری مس مارجرئی کی طرف
انصاف طلب نگاہوں سے دیکھا۔ تھی مٹی سی لڑکی تھی۔ بس کہ کھلکھلا کر ہنسی۔ بولی :
” پھر آپ نے اُسے ماچس دی ۔“

ہم نے کہا

” ہمارے پاس تھی ایک برسوں سے خریدی تھی ۔“

ایک دم سنجیدہ ہو کر بولیں :

” کیا تم واقعی ایسے ہی بیوقوف ہو جیسی باتیں کر رہے ہو ؟“

اس وقت آپ کے ہاں صبح دم یعنی دروازہ خاور کھلنے کا وقت ہو گا لیکن یہاں چڑمکے

نیم شب کا عالم ہے۔ ایک بچنے کو ہے لہذا گڈ نائٹ — باقی دارو

کچھ قصہ وال چپاتی کا

لندن پہنچنے کے بہت دن بعد تک ہم انگریزی کھانے کو ترستے رہے، ہمایہ کو جس شام ہم
 یہاں داروہوئے ہوئے میں ایک پاکستانی صاحب بی گئے، بوسے چلتے، پہلے آپ کو کھانے کا ٹھکانا بتا
 دوں۔ ہم نے کہا: بسم اللہ تو پر پیچ لگیوں میں سے گئے، اور ایک جگہ سے جا کر کہا: یہاں آپ کو عمدہ
 پاکستانی کھانا اور سلاں گوشت ملے گا۔ اچھا تو نہ تھا۔ قیے میں پانی بہت ڈال رکھا تھا، لیکن خیر۔
 دوسرے روز بی بی سی میں ہمارے دوست آصف جیلانی نے بی بی سی کلب میں جہیں پڑھا اور کباب
 کھاتے، تیسرے دن انعام عزیز کھینچ کے ایک جگہ سے گئے جہاں جُنا گوشت، مغز اور ماش کی والی
 اور گجھار سے بنی گن وغیرہ بھی تھے۔ چوتھے دن بدر عالم صاحب نے مہمان نوازی کا حق ادا کیا
 اور ہمیں رات کو جوش کھلا کر جوش کے روغنی شعر بھی سناتے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ یار دھری
 کانٹے کی نوبت بھی آئے گی کہ نہیں کہ جبرائیل اپنے گھر لے گئے اور کہا۔ دلائی لاما کھا کر
 تم بے مزہ ہو گئے ہو گئے، تو آج پاکستانی کھاؤ۔ اب ہم ان سے کیا کہتے، بہت رغبت سے
 ان کی روٹیاں بھی توڑیں۔ پھر سید سبط حسن کی ایسٹرن فیڈرل کمپنی نے ایک دعوت کر دی۔ اس
 میں بھی چاؤ، بریانی، بیخ کباب اور پڑاٹھے ہی تھے۔

ایک جگہ تو جہاں بدر عالم ہیں بے گئے تھے۔ میرے نے کہا
 "جناب کیا پان نہیں کھاتے گا؟"
 ہمنے کہا: پان؟

بوسے: جی ہاں! کیسا کھاتے ہیں آپ برابر کا؟

بہت دن سے پان نہیں کھایا تھا۔ اس روز اس کا بیڑا بھی مٹ نہیں رکھا۔ بعد میں معلوم
 ہوا کہ ڈھونڈنے والے کو پان بخوبی مل جاتے ہیں۔ لیکن سڑک پر پچکاری مارنے کی اجازت نہیں
 جگہ جگہ کھا ہے کہ کچرا ڈالنے یا گندگی پھیلانے والے کو دس پونڈ جرمانہ۔

ہمارے ہاں کے ایک بزرگ کہ اسمبل کے اسپیکر تھے۔ ایک روز مینیو اسکے ہوٹل کے باہر
 میر کر رہے تھے اور پان کی پچکاریاں مار رہے تھے کہ کچھ بچوں نے دیکھ دیا اور پولیس کو رپورٹ کی کہ
 ایک شخص خون تھوک مار رہا ہے۔ فوراً کانسٹیبل آئے اور کہا کہ چلو اسپتال۔ یہ بہت جتنا آئے اور انگریز
 میں غصہ کرنے لگے کہ میں تو یہ ہوں۔ وہ ہوں مجھے تم جیل نہیں بھجوا سکتے لیکن مینیو اسکے کانسٹیبل انگریزی
 زبان کیا جانتے؟ اتفاق سے ایک جیسے انس کاگزرا دھر رہے ہوا۔ انہوں نے صورت حال سمجھی اور
 سمجھائی۔ اور ان سے کہا کہ پانوں کی ڈبیا نکال کر انہیں دکھائیے۔ بڑی شکل سے چٹکارا ہوا۔ لیکن
 ہوٹل والوں نے ان کے غصہ ختم کرنے کو بھی زنجیں پایا۔ تو بہت جربز ہوئے۔ یہاں تک تو انہوں نے
 برداشت کیا۔ لیکن ایک دفعہ ان بزرگ کو شک ہوا کہ یہ گوشت جو ہوٹل والے دیتے ہیں۔ شاید
 ذبیحہ نہیں۔ انہوں نے ہوٹل والوں سے کہا۔ مجھے اپنا بار وچی خانہ دکھائیے۔ وہ ایسا مصفا اور مجتہد
 تھا کہ ہوٹل والے اکثر مہانوں کو فخریہ دکھاتے تھے۔ ان کو بھی سے گئے۔ سارا دودھ کی طرح اسپید۔
 انہوں نے کہا کوئی مرغی ناؤ۔ وہ مجھے یہ موٹرز ریڈ کی مرغیاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک پلی ہوئی مرغی



لاکر انھوں نے دی۔ پاس ہی چاقو پڑا تھا۔ انھوں نے اشد ابھر کر اس کی گردن پر پھیر دیا۔ وہ پھر ٹھٹھا کر کے اتر سے نکل گئی لیکن ادھر کئی گردن کے خون کے چھینٹوں سے بھی کے پکڑے ٹھنڈے ہو گئے۔ سارا باد پھیلا ہوا بھی نہ لگتا ہو گیا۔ یہ وہاں میں خود مرغی یا کوئی اور جانور فوج کرنا جرم ہے۔ وہاں بھی یہ اپنی حیثیت کا حوالہ دے کر چھوٹے لیکن بعد میں اس ہوٹل کے پاس اتنی کو دیکھ کر انکار کر دیتے تھے کہ ہمارے ان کمرہ نہیں ہے۔

لندن میں کوئی دوسرا ہوٹل ہوں گے جن میں ویسی کھانا ملتا ہے۔ ممکن ہے زیادہ ہوں۔ ان میں سے اکثریت سلیٹ داؤں کا ہے۔ کچھ سیر پور کے بھی ہیں۔ پھر کچھ ہندوستانی بھی۔ ان ہوٹلوں کے نام عجیب ہیں: تاج محل، نام کے تو کئی ہیں۔ پھر موتی محل اور ہیرا محل۔ محل کے لفظ کو تابع محل جان کر ایک صاحب نے تو تندور محل ہوٹل بھی کھول رکھا ہے۔ ایسی کوئی دلی درد بار ہوٹل یا انڈی رحمت کا محمدی ہوٹل البتہ ہماری نظر نہیں پڑا۔

لندن میں آٹا وال مرچ مسے ہدی دھینا ہر چیز مٹی ہے اور خالص مٹی ہے۔ گھی کی جگہ لکھن ہے اگرچہ بعض شوقینوں کے لئے دکاندار لوگ خالص پنجاب کا گھی بھی منگوا رکھتے ہیں۔ اجار بھی ہر طرح کا موجود رہتا ہے۔

پچھلے جتنے ہم لندن سے باہر میسر اور برٹلمم بھی گئے۔ برٹلمم کے بعض محلوں میں ایشیا کے ایڈیٹر حبیب الرحمن صاحب جیسے گئے۔ بائبل گزروالے اور سیالکوٹ کا نقشہ پایا۔ ایک مرگ پر تو ستر فیصد دکانیں پاکستانیوں کی تھیں۔ یونیس سوٹ مارٹ سے ہم نے بھی پیرس اور طبعیاں کھائیں۔ یہ دکان دین محمد قصائی حلال گوشت دہلے کی دکان کے عین سامنے ہے۔

جہاں مستقل رہنے والے پاکستانی بالعموم پاکستانی قصائیوں سے گوشت لیتے ہیں۔ جاہلوں کا نہیں
ہیں جن پر لکھا ہے۔

”یہاں حلال گوشت ملتا ہے“

(بعضے ہال گوشت بھی لکھتے ہیں)

لیکن ایک پاکستانی عالم صاحب کا کہنا ہے کہ ہمارے یہ جہاں اتنی تو گوشت منگایا جیتے ہیں
پھر اس میں پاؤ بھر ڈی ضرور ڈالتے ہیں۔ پھر ان کا رویہ خاصا مذمت ہوتا ہے۔ لہذا میں تو اب
انگریز قصائی کے اُس سے لینے لگی ہوں۔ سستا ہوتا ہے اور صاف اور عمدہ ڈی چمچرے کی
مصیبت بھی نہیں۔

یہاں قصائی کی دکان آئینہ خانہ ہوتی ہے۔ جانوروں کا ڈاکٹر یا قاعدہ معائنہ کرتا
ہے۔ ہمدی طرح رشوت دے کر خانہ ساز اور نہ پڑھی جانتے والی جہانی مہرنیں ٹھونکی جاتی پھر
گوشت کے نہایت نفیس پارچے عری کاغذ میں ملفوف جے جوتے ہیں۔ ان پر ان کی قسم اور
قیمت لکھی رہتی ہے۔ بچنے والا سپید براق ایپر بنڈے ہوتا ہے بیشنوں کے دروازے ،
کھرکیاں اور ٹنڈا رکھنے کو فروج۔ کسی بار تو یہ گوشت کچا کھانے کو بھی پاتا ہے۔

حلال و حرام کا امتیاز بڑی اچھی بات ہے لیکن اب یہ جہیں تک رہ گیا ہے بلذات میں ہمارے
بھولن میں ایک صاحب ایک اسلامی ملک کے تھے۔ دو تین روز کو آتے تھے۔ انگریزی نہ جانتے تھے
لہذا ہمیں ترجمانی کرتی پڑتی تھی۔ مسز واٹسن نے پوچھا ان کو انڈیا اور بلین دونوں جہم نے کمالے حرا

خبردار! جیسا ناشتہ ہیں دیتی ہر اسے بھی دو مسلمان بجائی ہے۔ اس نے خالی اندھے توں لائیے
 ابن صاحب نے ایک روز تو کھائے دوسرے روز ہم سے کئے گئے۔ بڑی بی سے کہو میں جنسالی
 انڈوں پر نہ ٹھٹھٹے۔ ان کے ساتھ بیلن بھی دیا کرے۔ جب ہم نے وہ بے صفوں میں کچھ لکھا تو بخشنے
 گئے کہ مسلمان کا ایمان تو دل میں ہوتا ہے۔ معدے میں تھوڑا ہی ہوتا ہے اور شروع میں سورا اس
 لئے حرام قرار پایا تھا کہ گندہ ہوتا ہے اور گندلی کھا تا ہے اب تو دیکھو کس طرح خاص طور پر
 خوراک کے لئے پالا جاتا ہے۔

ہم نے کہا بھائی تو جرجی چاہے کھا۔ ہمیں مت تائل کرنے کی کوشش کر۔ آئندہ ہم تیری رحمانی
 کریں تو سورا کھائیں۔

لندن کے ایک اردو ہفتہ وار میں ایک پاکستانی مقيم انگلستان نے لکھا ہے کہ ہم پر قہر ابھی
 نازل ہونے والا ہے۔ وہ اس لئے کہ یہاں اگر پاکستانی پیر پینے لگتے ہیں۔ قہر ابھی کی ذمہ داری
 ہم نہیں لیتے بلکہ شراب کے پرانے یہاں ضرور پیتے ہیں اگرچہ جتنے بت کم لوگوں کو دیکھا ہے
 یہاں جیوی کھانے سے پہلے گھر میں بھی خشکی لگاتے ہیں۔ گلی کے کونے کے پب میں بھی پیاس
 بجھاتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں۔ ٹھنڈی آب دہرائیں خون کو گرم رکھنے کا ایک بہانہ
 ہے۔ اک گونہ بخجروی اس سے متی ہے۔ سے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو۔

ان شراب نوشوں اور کافروں نے آنا التزام البتہ کیا ہے کہ کوئی بے دزد گار بھی ہو تو
 جھوٹا نہ مرنے پائے۔ اسے اتنا ذلیفہ سرکار سے ضرور ملے کہ گزارہ کر سکے۔ دکان کا کرایہ ملے
 سکے۔ پٹری سے پس سکے اور اس کے بچوں کو دودھ میسر آ سکے۔ جتنے زیادہ بچے ہوں گے۔ اتنی
 زیادہ اس کی جان سکھی ہوگی۔ کام پر لگے تو انکم ٹیکس لم ہوگا۔ بیروزگار رہے تو ذلیفہ زیادہ ہوگا۔

ایک صاحب ذکر کر رہے تھے کہ ہمارا ایک کرک نوکری چھوڑ گیا ہے۔ کتنے دگ جناب ڈیڑھ
 پونڈ میں ہفتہ بھر نوے پانچ بجے تک کام مجھے تو نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ ہیروز گاری کی
 صورت میں اسے جتنا وظیفہ ہفتے میں مل سکتا ہے، اتنا وہ اس سے فقط ڈیڑھ پونڈ زیادہ ملتی ہے۔
 پھر کسیوں نہ گھر میں پڑا چار پائی توڑے۔ اور منجھے مل کرے۔ ایک مزدور کا بھپے دنوں میں ویشن
 انٹرویو آیا تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ کام کیوں نہیں کرتے؟ بولا۔ جناب کام کروں تو بیوی بچوں
 کو کیا کھلاؤں؟ تفتیش پر معلوم ہوا کہ آٹھ بجے ہیں۔ اگر کام کرے تو سولہ پونڈ ہفتہ پائے گا۔
 ہیروز گاری کا وظیفہ ساٹیس پونڈ فی ہفتہ بن جاتا ہے۔

کچھ چھوٹیاں کلچر کی

ہماری ڈائری سے یہ گمان نہ کیا جائے کہ ہمارا سارا وقت یورپ میں مکان کی تلاش یا غسل خانوں کی پیمائش میں گزرتا ہے۔ لیکن کیا کیا جلتے جہاں رہنا چاروں ہوا اور ان میں سے دو آرزو میں کٹ جاتیں دو انتظار میں۔ وہاں اور کیا عمل گفتگو ہو سکتا ہے گیارہ بارہ دن سزاؤں کے بوسیدہ تہ خانے میں بسر کرنے کے بعد یہ کمرہ ملا ہے۔ عینہ، خواگاہ، عینہ، نشست گاہ۔ عینہ، غسل خانہ بھی جونی زمانہ نہیں ملا۔ کرایہ اس سے پونے دو گنا لیکن خیر۔ ہمارا آواہات تو غسل خانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ من کا میلوں دور نہیں کر سکتے تو ق تو ا بھلا رہے۔

ان کردار اب دینوی سے فرصت پا کر ہم کلچر کی چھوٹیاں بھی کہتے رہے ہیں۔ برٹش میوزیم میں گئے۔ کیا پرانی پرانی چیزیں بھر رکھی ہیں۔ ٹوٹی پھوٹی سورتیاں۔ پرانے وضع کے ٹکے اور نوٹے۔ عیالی کیڑے کھائی کتابیں۔ ان سے کہیں بستر چیزیں تو یہاں بازار کی ہر دوکان میں مل جاتیں گی۔ اور تھی۔ اس کے کتب خانے کو بھی ہم نے دیکھ ڈالا۔ وہی دانیو کا کوئی ناول نہ ملا۔ کارڈیوٹونے گئے تو ایک تریش رو اسسٹنٹ نے کہا۔ کبھی پہلے بھی ممبر رہے ہو؟ ہم نے کہا اہ آج سے چھ سال پہلے ستمبر میں بنا تو تھا۔ وہ چھت پر گیا اور ہمارا کارڈ نکال لایا۔ کارڈ بنانے

والا بہت خوش حال اور علم کی قدر کرنے والا تھا۔ اس نے ہمدانی عیثیت کو ہائے چہرے ہی سے بھانپ لیا۔ اور ہمارے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھا۔ ہم آبدیدہ سے ہو گئے کہ موتی کی قدر مند سے نکل کر اور ہیرے کی قدر کان سے باہر آکر ہی ہوتی ہے۔

مصر کی قدیم تہذیب کا ہم نے بہت شہرہ سنا تھا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ ولادت مسیح سے ہزار دو ہزار سال پہلے تہذیب کمال کہ منجی ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے اہرام بنائے۔ میاں بنائیں اور دفن کیس اور نہ جانے کیا کیا کیا۔ برٹش میوزیم کے کئی کمروں میں اس تہذیب کے آثار پھیلے ہوئے ہیں جن میں بادشاہوں اور پادشہوں کے علاوہ ان کی روزمرہ زندگی بھی کھلونوں اور ٹائلوں کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم تو ذرا بھر متاثر نہیں ہوتے۔ ان کے تین ہزار سال پہلے کے آلات زراعت دیکھے۔ کوئی کمال نہیں دیکھے ہی ہیں جیسے آج کل ہم ہتھال کرتے ہیں۔ لوہاروں اور برہمنوں کے تھوڑے اور تیشے بھی ایسے ہی ہیں جو پاکستانی ریاست میں متعل ہیں۔ لباس کا بھی ایسا زیادہ فرق نہیں۔ زمین سے پانی نکالنے کے طریقے رہٹ اور ڈھیلے وغیرہ فرود ہمارے آج کل کے دیہاتی طریقوں سے فدا بہتر ہیں لیکن ایسا زیادہ فرق نہیں کہ اکس پر کتابیں لکھیں۔ قدیم مصر کی کھدائی کرنے والوں نے شاید ہمارا ملک نہیں دیکھا، ورنہ انھیں میں کھودنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ زمین کے اوپر ہی یہ ساری چیزیں اتنی افراط میں مل جاتیں کہ ایک چھوڑ دس میوزیم آباد کریں۔

اہرام ہم نے ابھی نہیں دیکھے انشا اللہ اسی سفر کے دوران دیکھیں گے لیکن تصویر سے تو بعض نیکیے مگو نے مینار نظر آتے ہیں۔ سنا ہے بیس بیس تیس سال میں بنے ہیں۔ یہ بھی کوئی کمال نہیں ہمارے ان قائد اعظم کا مقبرہ بھی دس سال سے بن رہا ہے اور کچھ عجیب غریب تعمیر میں ہم اہرام کو چھپے چھوڑ جائیں۔ اس زمانے کے مصری نہ مائی لگاتے تھے نہ سوٹ پہنتے تھے

اور یہاں تک دریافت ہوا ہے کہ انگریزی تک نہ بولنا جانتے تھے۔ پھر بھی ہمارا ذکر کہیں نہیں اور ان کی تہذیب کا غفلت ہے۔

اچھے دقتوں کے ہیں : لوگ انہیں کچھ نہ کہو

جس سرسید احمد خاں کے ایک رسالے کی تلاش تھی جو انہوں نے ہندوستان کے قدیم
وہی نظام پر لکھا تھا۔ سرسید کی تالیفات میں اس کا ذکر کم ہی آتا ہے۔ خیر وہ مل گیا۔ لیکن ہم نے فہرست
میں دیکھا کہ مصنف کا نام احمد خاں درج ہے : احمد خاں سید۔ غالب کو بھی ہم نے غالب کے
تحت نہیں بلکہ اسد اللہ خاں کے تحت پایا۔ لکھا تھا : اسد اللہ خاں مرزا۔ آگے چلا کر لکھا ہے کہ
غالب بھی کہتے تھے۔ نہرستیں بنانے والے انگریزوں کی ریدہ ریزی کی پھر بھی داو دیجئے،
کیونکہ ان کے اس کتاب پر سید حامد خانام لکھنے کا دراج ہے۔ ولیم شیکسپیر یا چارلس وولز
جارج برنڈشاؤ وغیرہ۔ یہاں ہم نے اردو الف بیلہ کے پڑنے نئے نئے نکلوانے تو ایک پر موقوف
کا نام یوں لکھا پایا ہے۔

تالیف ناظم و ناشر بے مثال بذلہ مسیح نازک خیال جہاں بخش اردو زبان اعلیٰ زبان
جناب میرزا رجب علی بیگ سردر۔

ہم تو خیر جہاں جلتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں خود اپنے نام کے ساتھ حقارت یا ناخاندانے سخن
دیگرہ لکھنے کی روایت ہے۔ لیکن ایک انگریز کا اس میں غلطی نہ کرنا بھیج نام نکال دینا نکال کی بات
ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ان کا نام فہرست میں ب کی تحت میں یوں ہوتا۔ بذلہ مسیح نازک خیال
جو علی بیگ سردر بھی کہتے تھے۔ دیگرہ۔ خیر موصوف نے جس طور آغا زارستان کیا ہے وہ بھی سننے
کے لائق ہے۔ یہاں سے یہ کچھ نثران، پندرہ دروان، آوارہ چار سو، سرمد حیرت درگم، غزالیہ

جس نے گم کردہ دھن یاد دیا۔ اسے دُور مرزا جب بھی بلک سرور، سخن فہم تقدرواؤں کی صبح فراشی اپنے زخم جگر پر نلک پاشی کرتا ہے۔۔۔۔۔ آگے تو بیخ کی ہے کہ ترجمہ توافقی لیلہ کا اردو میں تھا لیکن سید حامد حاکم فہم زبان میں تھا۔ ایک رئیس نے فرمائش کی کہ بابا مجھ سے یہ نہیں پڑھا جاتا، اسے صبح اور صغنی شری میں دوبارہ لکھو۔ اس فقر نے اس فرمان کو واجب تیس جانا۔۔۔۔۔

کتاب کے آخر میں سچو دین سراپا میوب محمد یعقوب سخور فصیح اللسان محمد صادق خاں اور جابا منشی وحیث رائے محقق کے لکھے ہوئے قطعات تاریخ بھی شامل ہیں۔

میرزا حیرت نے جو الف لیلہ ترجمہ کیا لیلیٹ کی اس کی پیشانی پر لکھا ہے۔ الف لیلہ شریطرز نادل۔ یہ اس زمانے کے آدمی تھے جب پرانی اردو میں نئی روشنی کے پیوند لگے تھے اس میں ہر جگہ لکھنؤ مکالموں کی شکل میں ہے۔ اندرون سرور قی ایک طرف تو ناشر محمد انیسٹر و ناظم فنیہ امثال حضرت مولوی محمد اقبال حسین المتخلص بہ عاشق دام فیض کے دیوانوں اسرار عاشق اور انوار عاشق کا اشتہار ہے۔ جن کو معافی تفر کا دفتر اور محاورات اردو سے معنی کا مخزن کہا گیا ہے دوسری طرف کتب زیر صبح میں لندن کی میس، پیرس کی میس، برلن کی میس کے نام درج ہیں۔

۱۸۷۰ء میں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے۔ انگریزی سے خوش چینی کی بھی تو کیا کی۔ میرزا حیرت کے سدس حیرت کا اشتہار بھی دیکھا۔ اس سدس میں مرزا حامی کے سدس کی تردید بڑی بیاعت سے کی گئی ہے۔ جس زبان پران کو بڑا ناز تھا۔ اس کو وہی کے محاورے کے خلاف ثابت کر کے ٹکایا ہے۔ اتنے یہ آگے رفتوں کے لوگ جن میں سے کچھ آج بھی باقی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے میں فنی کتابیں بھی لکھی جاتی تھیں۔ ایک کا اشتہار دیکھے۔ رسالہ کبوتر بازی مع لکھل قبل از مرزا محمد اختر، کمپیوٹر تو بڑی بات ہے اگر اس ماحول میں پے ہوؤں کی عقل بائیسکل کو دیکھ کر حیران و حائے

تو قابل معافی ہیں۔

آج کل مارکس کی صد سالہ برسی پر سیاں برٹش میوزیم میں مارکس کی کتابوں کو پرانے ایڈیشنوں کی نمائش ہو رہی ہے۔ ان کے خطوط بھی انگریزی اور فرینچ میں لکھے ہوئے رکھے ہیں۔ مارکس بہت دن لندن میں رہے۔ اور امریکی کے انگریزی اخباروں کے نامہ نگار تھے۔ زیادہ وقت یہیں برٹش میوزیم کے دارالمطالعہ میں گزارتے تھے۔ کسے معلوم تھا کہ انہی کی تحریریں انگریزی اور امریکیوں کے پاؤں تلے سے زمین نکالیں گی۔

ہاں ہم نے اس بالکل سرلارنس او لیور کا ایک کھیل بھی دیکھا۔ سعید جعفری ایک ذہین نوجوان ہیں اسٹیج پر نہایہ بیدار رہے ہیں۔ وہ سٹرنڈ برگ کے ڈرامے رقص موت کے ٹکٹ کہیں سے آئے اور تو ان کے چار ماہ کے لئے ساری میٹیں بک تھیں۔ اداکاری کی تھی 'اعجاز تھا اعجاز'۔ یہ کھیل وقفے وقفے سے اولڈ وک تھیٹر میں ہو رہا ہے۔ یاد رہے کہ گزشتہ مئی میں سرلارنس کے پتے کا اپریشن ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے لکھی جتنے مکمل آرام کی ہدایت کی تھی۔ لیکن اسی ہی دنوں ان کی منڈی کے ایک دو کھیلوں کی ریسرچیں ہو رہی تھیں۔ موصوف اور پر کی منزل سے کھڑکی کے دستے نکل پاپ کو بچ کر اتر آئے اور آج تک فراد ہیں۔

نہیں ہم اپنے وطن میں بھی عموماً یا تو کارٹون دیکھتے ہیں یا لارل مارڈی سے رغبت

رکھتے ہیں۔ سریاں کے کھیک سینماؤں میں جہاں یہ سال ہے کہ ابو حروہ بے ادھر نکھے۔ اور پھر باادب باطلہ منظر جو شیار۔ اوپر کی آنکھیں اوپر نیچے کی نیچے۔ ہم نے فینن ہل بھی دیکھی۔ سوائے زمانہ فحش کتاب کی فلم باہر نکھا تھا خاص برائے بالغان لیکن خیر میں کسی نے نہ روکا۔ ہم اس فلم

کو دیکھ کر پہلے پہلے پھر روئے۔ کیونکہ اس میں تو فنی بل بالکل نیک پرین ہے۔ جتنے لوگ
اُسے گناہ پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی آبرو پر حملے کرتے ہیں ان سب کو وہ
مروانہ وار پھپھاتا دیتی ہے۔ انجام بالکل ہمارے فلوں کا سا ہے۔ آخر کسین میں اس کا ناکاج گرجا
میں ایک ادبائش سے کیا جا رہا ہے کہ ہیرد یعنی بی بی کا اصلی اور مخلص عاشق زار و روانے توڑ
کر اندر آتا ہے اور بیانیگ و بل اعلان کرتا ہے۔ یہ شادی نہیں ہو سکتی اور آخر وہ باصحت
خاتون اپنے پاکباز شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے چلی جاتی ہے۔ اس سارے قصے
میں فتن صرف ایک چیز لگی۔ وہ گایاں جو غم دیکھنے والے بانٹ اپنے پیسے برباد ہونے پر
سینا والوں کو دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے اس غم کا سینا ریکسی و کٹورین ایوب سے لکھو یا
گیا ہو۔ بلکہ کہ جب نہیں ملے و کٹورین نے خود لکھا ہو۔ یہ فلم تو شیر خوار بچوں تک کو آسانی سے
دکھائی جا سکتی ہے۔



ٹاور سے موسم گھرتک

تہائی، تہائی۔ اسی نوے لاکھ بلکہ شاید کروڑ سے زیادہ آبادی کے شہر میں تہائی بلکن
تھا گریٹن میں ایک مزار بھی ہے جسے تو غالب نے اس کی تہائی تھی کہ وہ
”رہے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو“

نوع انصوں نے شاید اپنے لئے مانگی تھی پوری ہمارے حق میں ہوئی۔ غالب نے بے در
د دیوار سا اک گھر چاہا تھا۔ پچھلے ہفتہ تک ہمارا جو کمرہ رہا ہے۔ اس کا ناک نقشہ اس سے چند
مختلف نہ تھا۔ غالب کو یہ بھی حسرت تھی کہ کوئی ہمسایہ نہ ہو اور ہمزبان کوئی نہ ہو۔ ہمسایہ تو خیر
بے شمار ہیں۔ لیکن بڑے شہر کے ہمسائے کیا۔ برسوں رہ کر ایک دوسرے کے غم میں شریک ہونا تو
درگزار ایک دوسرے کے نام سے بھی واقف نہیں ہو پاتے۔ ہم زبانی لایہ ہے کہ ہمارے ہوٹل
میں قریب قریب بھی افریقی ہیں یا پھر ایک امریکن لڈا ہے۔ ناشتے پر گڈ مارنگ۔ گڈ مارنگ
ہر جاتی ہے۔ اور بس۔ غالب صاحب کو یہ بھی آرزو تھی کہ پڑیے کہ بیمار تو کوئی نہ ہو تیار دار۔
سو بھر اولاد آدم یہ بھی گزری۔ ہم کھانسی بخار نہ کام میں ڈیر لکھ دن تک اپنے کمرے میں پڑے
رہے۔ کسی نے نہ پوچھا کہ بھیا کیسے ہو؟ آخر خاؤں کیپر کے کھنے پر سینٹ میری اسپتال کے آؤٹ

پشٹ نرپاڈنٹس میں گئے۔ انہوں نے کہا فلاں سڑک کے فلاں کوپے میں ڈاکٹر مارٹ کے پاس جاؤ اور یہ پرپی دے دو۔ وہ سیجائی کریں گے۔ وہاں پہلے ہی پندرہ آدمی انتظار کر رہے تھے اور اپنی اپنی باری پر ڈاکٹر سے پوچھتے تھے کہ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟ ہمیں بھی انہوں نے ایک منٹ میں جگتا دیا۔ یہ بات کچھ اچھی نہ لگی۔ کیونکہ ہمیں ذرا دل جمعی سے عرض حال کرنے کی عادت ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ کیا بیماری ہے۔ کھانے میں کیا لکھائیں اور کس شے کا پرہیز کریں۔ کھجڑی ہمیں پسند نہیں کچھ اور بتائیے۔ کیا وہی بڑے ہاشش کی دال اور بڑے گوشت کے کباب کھا سکتے ہیں؟ دن میں کسے بار دوا لینا ہے وغیرہ.... جس ڈاکٹر کو اتنا کچھ سننے کا یار نہ ہو اس کے پاس ہم جاتے ہی نہیں۔ بلکہ یہ معاملہ پرد میں کا تھا۔ اس مرد متکبر نے پرپی پر کچھ لکھ دیا کہ کسی کیسٹ کے پاس چلے جاؤ۔ کیسٹ نے ایک بچکاری سی دی کہ نہ کھول کر لگے میں مارو۔ ہم نے کہا۔ دن میں کسے بار دوا اپنے گلے میں یا کسی اور کے... فرمایا یہ تو ڈاکٹر سے پوچھنا تھا حضرت۔ ہم نے کہا پیسے؟ جو بے پیسے کچھ نہیں۔ اس ملک میں علاج معاہدہ مفت ہے۔ یا یوس اور غیر یوس (الطرح ہر قسم کے مریضوں کا)۔

ہمیں یہ بات معلوم ہوتی تو ہم اب تک کئی بار جیاد پڑ چکے ہوتے۔ امریکہ میں تو ہر چیز کی طرح علاج بھی اتنا مہنگا ہے کہ اس کے لئے جہاں بھی پڑتی ہے۔ اسی لئے بہت سے امریکن اپنی ہسپتال جیادیوں کے علاج کے لئے ٹورسٹ بن کر انگلستان آجاتے تھے۔ یہاں ہسپتال میں داخل ہو جاتے اور مزے کرتے۔ کزیہ وغیرہ دے کر بھی امریکہ کے مقابلے میں بہت سستا رہتا تھا۔ اب شاید کچھ پابندیاں لگ گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اسی بیماری کا علاج مفت ہو گا جو یہاں آکر ٹکی ہے یہ نہیں کہ آپ باہر سے بیماری لے کر آئیں۔ ہم بھی اپنی بیماری دل اور درد تنہائی کا علاج یہاں کرانا چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ بھی یہی قیامت لگی ہے کہ یہ آزار پاکستان سے ہم اپنے ساتھ لے

کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں نے ان کی دعا کرنے سے انکار کر دیا۔

ڈکٹر سائرس کے منہ کا تھا۔ آج ہی کا بیٹے۔ جس نعلی گئے۔ جس سے ہمارا مطلب ہے
 گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کیونکہ یہ ایک لمحے ہم نے لندن میں بھی آداب بحر خیزی۔ آدمی رات
 سے کچھ پہلے واپس آئے۔ آج جھٹکے کا وہی تھا۔ دفتر آج بند رہتے ہیں۔ کوئی کار منفعی تھا نہیں۔
 لندن نامہ کار رخ کیا۔ نامہ ہم نے ۱۹۶۱ء میں بھی دیکھا ہے لیکن اس میں ایک عجیب سی کشش
 ہے۔ اس کی زیادہ علامتیں تیرہویں صدی کی ہیں بعض اس کے بعد اور اس سے پہلے کی بھی۔
 یہ عجیب جلتے عبرت ہے۔ کتنے ہی بادشاہوں اور ملکاؤں اور امیروں نے ان برہمنوں میں
 امیری کے دی گزاردے اور پھر اکثر نے یہیں جلاؤ کے کھلاڑے کے سپرد اپنی گردنیں کیں۔ وہ
 جگر اٹھانے کے اندر زنجیروں سے صندوق کے الگ کر دی گئی ہے، جہاں ملکاؤن بومین دہتری
 ہشتم کی دوسری حکیم) اور ملکاؤن بومین (انہی بادشاہ سلامت کی پانچویں پوری ہینڈی چین
 گئے دو تین مشورہ نوابوں اور نواب نادویوں کے سر قلم کئے گئے۔ ملکاؤن بومین سے ایک عایت
 البتہ برقی گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میرا سر کھانڈے سے نہیں توڑے قلم کی جلتے پانچو اس کے لئے
 خاص طور پر تیار منگائی گئی۔ ایک امیر لاڈو اسپلنگ نام کے ڈیوک آف گوسٹر کے دیباہیوں میں سے
 تھے۔ نہایت منتظم بنے جلتے تھے۔ ان سے کوئی قصور ہوا تو آفاتے دلی نعمت نے کہا جناب
 لاڈو صاحب، آپ سے زیادہ رموز مملکت کوئی ہوتا ہے۔ آپ کے جرم کی سزا قاعدے سے کیا
 ہونی چاہیے اس نے کہا جناب اس کی سزا تو از روئے قاعدہ گردن ہونا ہے۔ چنانچہ قانون کا
 آغا پورا کیا گیا۔

ان برہمنوں میں ہر ایرا غیرا قید ہونے یا گردن کٹانے کا شرت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ یہ

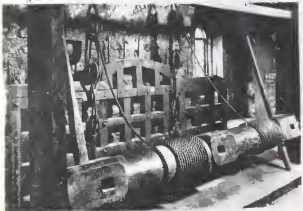


سجاست فقط شاہی خاندان کے لوگوں یا امرا کے حصے میں آتی تھی۔ کیونکہ جیل کا سارا خرچ نقد سے
 کا خرچ جتنی کہ جلاؤ کی نہیں۔ لکھاڑے اور کلڑی کے کندھے کا خرچ بھی مجرم یا قیدی ہی کے ذمے
 ہی تھا۔ داخل ہوتے ہی داہنے اٹھ کر باب خدراں کی چوڑی محراب ہے۔ دریا تے ٹیمرے ایک
 خندق بیاں آتی تھی اور قیدیوں اور گشتہ ہونے والوں کو ٹیمرے راستے اسی محراب کے نیچے
 سے بیاں لایا جاتا تھا۔ اس کے عین سامنے اسی زمانے کا خونی برج ہے۔ کیسے کیسے سرفرازان
 دونوں دروازوں کے نیچے سے گزرے تھے۔ سو سوویں صدی میں ڈیوک آف کیمبرلینڈ، ایلن بولین
 کراملین، ایلن آف ایلس۔ ملک کیتھرائن ہوارڈ۔ ڈیوک آف سرسٹ، یڈی جین کرے، ڈیوک آف
 میسٹھ اور نہ جاننے کون کون تو وہ ملک ازبجہ اول کچھ دن بیاں قید رہیں۔

خونی برج کے اوپر کے کمرے میں سردانٹریٹ نے اپنی امیری کے بارہ سال گزارے۔
 اس کا بٹنگ۔ اس کی کرسی دونوں موجود ہیں۔ یہیں اس نے تاریخ عالم کھس جس کا پہلا ایڈیشن اسی
 کمرے میں دھرا ہے۔ اوپر تو اسی جگہ ہے جہاں سے چند قدم ٹھننے کی اجازت تھی اور اب ٹمک

وائٹریسے واک کلاتی ہے۔ اس اولوالعزم کا آخر حکم شہنشاہی سے ۱۹۱۸ء میں سرق سے
 جدا ہوا۔ اس احاطے میں مرنے والیوں میں سے ایک بی بی خاص جرات والی تھیں۔ ان کو جرم
 بے وفائی میں جتاد کے پرد کیا گیا تھا۔ انہوں نے مرنے سے پہلے اعلان کیا کہ بے شک میں ملک
 انگلستان کے طور پر مردہ ہی ہوں لیکن یہ میرے لئے کوئی ذریعہ عزت نہیں۔ میرے لئے اسی سے
 زیادہ سرمایہ افتخار اپنے یار کی محبوبہ ہونا ہے۔ ان کا یہ آشنا بھی اسی چار دیواری میں افریت
 کی موت مرا۔

ٹاور کے ایک طرف کی عمارت میں اسلوا میوزیم بھی ہے۔ سنجوڑوں کے خود زندہ بلتر



خونی دروازے کی چرخی

اور چار آئینے تو ہر جگہ دیئے ہیں۔ لٹھروں کے ذرہ بکتر بھی کئی جگہ نظر آتے ہیں۔ اتھی کا ذرہ بکتر
 یہیں دیکھا۔ پورا اتھی کوسے کی ذرہ میں رہتا تھا۔ یہ ذرہ کویو صاحب ہندوستان سے لاتے تھے۔
 اور خیال کیا جاتا ہے کہ جنگ پلائی میں نواب سراج الدولہ کی فوج کے کسی اتھی کی زیرت رہی ہوگی۔
 بہت سے ہتھیار اور ذرہ ہیں یہاں ساختہ لاہور میں۔ ایک دو ساختہ سندھ بھی۔ ہتھیاروں میں
 شمشیر، خنجر پیش قبض، قزولیاں، بھانت بھانت کے تحفے ہندوستان کے یہاں دیئے۔

ٹاور آف لندن کے کوسے بھی مشہور ہیں۔ یہ کوسے ایک خاص نسل کے ہیں اور فقط ان بڑوں
 پر نظر آتے ہیں۔ کئی صدیوں سے یہ مشہور چلا آ رہا ہے کہ جس روز یہ ختم ہو گئے اسی روز ٹاور گر جائے
 گا۔ اور سلطنت انگلشیہ ختم ہو جائے گی۔ سلطنت انگلشیہ کے ختم ہو جانے میں کیا کسر رہ گئی ہے
 یہ تو ہمیں معلوم نہیں لیکن کوسے بہر صورت زندہ ہیں۔ اور واٹ ٹاور بھی سلامت کھڑا ہے۔

باقی دن ہم نے مادام تساد کی ٹوی بشیوں کی گیلری اور ان کا چیمبر آف اارز یعنی ایوان
 و بہشت دیکھنے میں گزارا۔ یہ بلیک سٹریٹ میں ہے اور اس میں موت کی سزا پانے والے مجرموں
 کے پتلے کھڑے ہیں۔ یہاں جب دھوکا ہوتا ہے۔ اندر داخل ہو کر ہم نے گارڈ کے پاسی کو ٹکٹ
 دیکھا یا تو اس نے توجہ ہی نہ کی۔ معلوم ہوا موسم کا سچا اور پھر چڑھے تو ایک پتلا باطل انسان کی
 صورت میں کھڑا تھا۔ ہم نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پیرا تو بولا: کیا کر رہے ہیں جناب، آئینہ خانے
 کی گیلری میں ہم نے ایک صاحب کو دیکھا کہ جس طرف کو ہم جاتے ہیں اسی طرف کو وہ لگتے ہیں۔
 آخر کھرا گئے۔ ہم نے کہا۔ سو دی لیکن شیشے کی تختہ کی محسوس ہوئی تب معلوم ہوا۔ یہ تو ہم خود
 ہی تھے۔ جہلاٹکس ہی تھا۔

لندن میں میوزیم ایک نہیں۔ بہت ہیں۔ ایک میوزیم سائنس کا ہے، ایک نچرل ہسٹری کا جس



مادام تستاند

میں جانوروں کے ڈھانچے رکھے ہیں۔ بیٹھے پورے پھیلیاں نیپ ڈھانچے وغیرہ لاکھوں سال پرانے ہیں۔ ایک آئرن فٹ بکھڑا (مردہ ڈھانچہ) بھی نظر آیا۔ جو کہ شوالک کے دامن سے پکڑا گیا تھا۔ پرانے جانوروں میں بیٹھے تو بارہ بارہ چوہہ چوہہ سون کے تھے۔ انسان ان کے ملنے کل کا ہتھ ہے۔ اس کی عمر جمعہ جمعہ آٹھ دن کی یعنی فقط تیس لاکھ سال بتائی جاتی ہے۔ جب کہ پھیلیاں ۵ کروڑ سال پہلے موجود تھیں اور پرندہ سے ۴ کروڑ سال پہلے۔ دودھ دینے والے جانوروں میں بھی انسان سب سے پچھڑی ہے کیونکہ دوسرے جانور میں کروڑ سال پہلے وجود میں آگئے تھے جاتے اتنے بہت سے جانوروں کا دودھ کہاں جاتا ہوگا۔ کہاں بکتا ہوگا۔ کون سی میں پانی ملتا ہوگا۔ کیونکہ انسان اس زمانے میں نہیں تھے تو کوالے بھی نہیں ہوں گے۔

نچرل ہسٹری میوزیم کے ایک برآمدے میں ایک درخت کا تپڑا نظر آیا یہ اتنا پرانا تو خیر نہیں کہ آثار قدیمہ دانوں کی توجہ کے قابل ہو تاہم ہماری عقل اسے دیکھ کر اور یہ جان کر حیران ہوئی کہ چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جب روم اپنے عہد زوال میں تھا تو یہ پودا ۴۲ سال کا تندرست

تھا۔ نبی کریمؐ نے جب مدینہ ہجرت کی تو ۶۵ سال کا تھا۔ برطانیہ کا مشہور بادشاہ "الفرڈ اعظم تخت نشین ہوا تو یہ بابائے درختاں زندگی کی تین صدیاں پوری کر چکے تھے۔

مشہور ٹی لندن برج جواب دہا کے دوبارہ بنایا جانے والا ہے اس درخت سے عمر میں ۲۵۰ سال چھٹا ہے۔ میلنا کارٹا پروستھٹ ہونے کے وقت یعنی ۱۲۱۵ء میں اس کی عمر ساڑھے چھ سو برس کی تھی۔ ٹیکسیٹر کے مرنے کے وقت ۱۰۶۹ء سال اور لندن کی مشہور آگ لگی تو یہ بزرگ گیارہ سو سال کے ہو چکے تھے۔

ہمارے ان بھی بڑے بڑے معزز درخت ہیں جس لمبی ڈاڑھیوں والے، لیکن یہ درختوں کا سرسبز دنیا بابائے اردو ان سب کا رشتے میں داددار ہے۔ انہوں نے ابھی اپنی عمر عزیز کے ۱۲۳۵ سال پورے کئے تھے کہ کسی ظالم نے ۱۸۹۲ء میں اس پر آ کر اچلا دیا۔
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھیلے مر جھانگئے

گورے دیکھے، کالے دیکھے

لندن دیکھا۔ لندن والے دیکھے، گورے دیکھے، کالے دیکھے، ہاں دوستو! کالے، یلکے
 سچ پچھے کالے۔ پچپچ بھی کالی، پر بھی کالے۔ گورے بھی دھوئی رو سیاہی کالے۔ یلکے فردا
 کی تقدیر معلوم ہوتا ہے کہ افریقہ کے اقدار میں ہے۔ احساس کمتری یعنی جہ؟ ہمیں تو اپنے ان
 بھائیوں میں صاف احساس برتری دکھائی دیتا ہے۔ لندن میں بیرونی غالب ظلوں میں ٹیکھو
 یا گلیوں، کوچوں میں کام کرنے والوں کو، ٹیوب میں، بس میں، فلیٹ میں، دکان میں ہر جگہ گورے کے
 ساتھ کالہ نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ تین ہیں یا تیر ہیں؟
 بیسوں ہیں یا شیعوں ہیں۔ گورا ہمیں گورا نہیں جانتا خواہ ہماری رنگت اس سے زیادہ سی
 سرخ و سپید کیوں نہ ہو، جنوبی افریقہ میں الگ پتھر پڑ جائے گا۔ کالوں میں ہماری گنتی ہوا کرتی تھی۔
 وہ بھی اس لئے کہ اصل کالے اس وقت تک باریکٹ میں نہ آئے تھے۔ کل ایمپڈ پارک کارنر میں ایک
 افریقی سے ہم نے بجائی چارہ جتایا تو وہ بولا: تم کس منہ سے خود کو کالہ کہتے ہو۔ جاؤ اپنا منہ دھو رکھو
 اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اقوام عالم میں عزت کی جا پانے کے لئے اپنے چہرے پر کالک ملیں یا
 طوائف؟ اپنے ہونٹ موٹے اور آنکھیں باریک کرائیں؟ اپنی جلد پر سفیدی کا آرڈر دیں یا

ژبی ریٹ پر خود کو دھو بی سے دھو دیں۔ اپنی ناک پر پیہ چرو میں یا پھر اپنا بیض و خنزق کاٹ لیں اور سرخروائی کے دیسے سامان بہم پہنچائیں کہ بھی ہیں پٹ کر دیکھیں اور ہم پر رشک کریں۔

یاد رہے! بڑائی رنگ اور فعل کی نہیں ہے۔ قرون وسطیٰ میں لندن اور پیرس گناہم ترے تھے گندگی کے ڈھیر تھے۔ پادری لوگ نہانے والوں کے کوشے ٹکرایا کرتے تھے کہ یہ مسلمان ہو گئے ہیں جمعہ کے بعد نہانے گئے ہیں۔ ۱۸۶۸ء سے پہلے جاپان کا شمار دنیا کی قوموں میں کیوں بھی نہ تھا۔ چینی بھی کن تک آدھے انچھی اور آدھے ڈاکٹر فو پاچو تھے۔ اس سے بہت پہلے ایک زمانہ تھا کہ یونان کے جہاز سے ہرجرت گزرتے تھے۔ پھر رومنوں نے بادشاہی کی۔ عرب کیا تھا بس اک جبریز تھا تھا۔ یلیں یہاں سے روشنی کی ایک مشعل چلی اور قرطبہ، بغداد، دمشق اور تسطیفیہ کے مناروں سے دنیا بھر میں علم و تہذیب کا نور تقسیم ہوا۔ سوسبتیں اور رنگیں یا زبائیں اور سرزمینیں اپنی بہت اور اپنے اہل سے سرفراز ہوتی ہیں۔ یہاں کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے۔ کسی فرتے یا ستر کی مخالفت موردی نہیں۔ ہم میں کیا نہیں ہے۔ ارض ہند کونک ہے۔ عرب کونک ہے۔ ایران کی موزرینت ہے۔ یلیں اسے خمار ہے لکام اور بیض خود پسند؛ بس ہیں! اپنے جی کو کین کھٹکت ہے۔

برطانیہ کے لوگ آج کل ایک سرکاری رپورٹ سے یہ معلوم کر کے بیلا اٹھے ہیں کہ ہر سال چھ ہزار دو سو ساٹھ سڈن انجینئر اور تربیت یافتہ کاریگر انگلستان سے دوسرے ملکوں خاص کر امریکہ کی راہ لیتے ہیں کیونکہ وہاں ان کو تین گنا زیادہ تنخواہ مل جاتی ہے۔ ایک انجینئر ساٹھ سڈن یا کاریگر کی تربیت پر بڑیے کا چھ ہزار پونڈ سے سو ہزار پونڈ تک صرف ہوتا ہے۔ امریکہ میں کسی کو تربیت دیں تو اتر ہزار پونڈ خرچ کریں۔



یہ چیز جسے برین ڈیری یعنی تربیت یافتہ لوگوں کی ملک سے ہجرت کہا جاتا ہے برطانیہ کے لئے
 اخصراً ہے تو ہم ایسے ملک کے لئے جو ترقی یافتہ نہیں بلکہ ترقی کی راہ پر ہے۔ ملاحظہ ہے پورٹ
 ایک پاکستانی بزرگ لندن سے گزرتے ہوئے ترک وطن کر کے مستقلاً کینیڈا جاتا ہے تھے اور بہت
 خوش تھے۔ کہتے تھے کہ پاکستان میں کیا دھڑا ہے۔ کینیڈا میں موٹی تنخواہ ملے گی۔ اگر ملک پسماندہ ہے
 تو کیا ہم بھی پسماندہ رہیں؟ اگلی نسلیں کے ہانڈے کے لئے اپنا آرام اور اپنی امارت کے لالچاں
 تیار دیں؟ ایک اور صاحب ہیں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں۔ کوئی پندرہ سال سے یہاں پڑے ہیں۔
 ہم نے سن سے کیا یہاں کیا لذت ہے۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تو پاکستان میں بھی عیش کرتے ہیں۔
 یہاں گھر کے برتن تک دھوئے ہوئے آج کل جیاد ہو کر اسپتال میں ہیں معلوم ہوا کہ کوئی دیکھنے
 نہیں جاتا۔ ان ترقی یافتہ ملکوں میں سارے رشتے اقتصادانی ہیں۔ بیوی بھی چند روز میں تنگ آجاتی
 ہے۔ ہم جیسا حال نہیں کر یا دوست بھی عیادت کو بدلے جاتا ہے ہیں۔ کمپری کے عالم میں ان پر
 رقت طاری ہوئی تو ہم نے کہا: میان بخوی بخوی پھر مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔ وطن میں آمدنی
 چاہے اتنی نہ ہو لیکن اس میں اس سے زیادہ عزت اور آرام سے گزارنے کی اور پھر اگر تم نے کچھ
 پڑھا لکھا ہے تو اس سرزمین کو بھی تو خاندانہ پہنچاؤ۔ جس نے تمہیں جنم دیا۔ آؤ بھر کر رہ گئے۔ انگریز
 بیوی کر دکھی ہے اسے پاکستان کا گرو جیاد پسند نہیں۔

یہی بات ہم نے ایک ڈاکٹر سے کہی۔ بڑے فوجی آدمی ہیں۔ لندن سے باہر ایک شہر میں رہتے
 ہیں۔ ایم بی بی ایس لاہور سے کیا تھا۔ کہنے لگے: ان لاہور لاہور ہے۔ یاد آتا ہے۔ اردو کی کتابیں
 رسالے بھی دیکھے ہوئے مدت ہوئی۔ اب تم نے دیکھتے تو وطن کی سونڈھی خوشبو آتی لیکن ہم نے
 یہ غلامیوں دہلی میں پرکھائیں گے کیا۔ اس کے بعد انھوں نے پاکستان میں ڈاکٹروں کے گریڈ بتانے

شرور کئے۔ پاکستان میں اپنی عازمت کے تجربے سنئے۔ ان کو ہم شافی جواب نہ دے سکے کیونکہ کچھ تصور ہمارا بھی نکلا لیکن ان ڈاکٹر صاحب کے نفع نقصان کو چھوڑ کر سوچا جائے تو کتنے لوگ عمارتِ ملک کے قصبوں اور دیہات میں محض ڈاکٹر نہ ہونے سے اور طبی امداد نہ ملنے سے مر جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کینڈا اپنے جائیں تو فیکری چٹکی سے علاج کرنے والوں، طبیبین و جاپان کے اشتہارینے والوں اور مفتاحیسی، انجینئریں اور کھنڈیوں والوں، غاموں کا غلوں، قعود گشتے کرنے والوں اور فٹ پتھر کے پردیسروں کی کیوں نہ چاندی ہو۔ ہم نے چین میں ایک ڈاکٹر سے کہا تھا کہ تم یہاں دوسو روپیہ ماہوار سے کر لیا کر سہے ہو، کینڈا اپنے جاؤ، دس ہزار روپے میں گئے، مسکرا کر کہنے لگا کہ میں روپیہ ہی تو سب کچھ نہیں ہے اگر میرا ملک کنگڈا ہے تو میری امیری کس کام کی۔ چلو تو سامے زمانے کو ساتھ سے کے چلو۔

ہمارے ملک میں جو لوگ مزدوری پیشہ ہیں۔ کوئی ٹیکنیکل مہارت نہیں رکھتے۔ وہ شوق سے دوسرے ملکوں میں جائیں۔ اپنی حالت سدھاریں۔ کمائیں گے تو ان کا کچھ پیسہ زربادہ کی صورت میں ملک میں بھی آئے گا۔ لیکن ڈاکٹر انجینئر سائنسدان تو ہمارے ہاں لاکھوں میں ایک نکلتا ہے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ اور ہمارے ساتھ نہ رہا تو یہ چار سالہ اور پانچ سالہ منصوبے آپ کیسے پورے کریں گے۔ چوں کہ مارکو تو کارخانہ نہیں بنایا جاسکتا نہ اہم ضامن باندھ کر اسے چلایا جاسکتا ہے۔

کچھ لوگوں کو باہر جانے کا یوں ہی شوق ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دوست جنھوں نے نہایت اعلیٰ تعلیم پائی تھی۔ یہاں لندن میں کچھ دن ایک ہوٹل میں بیرے رہے۔ پھر ایک جگہ چوکیداری کی۔ بس کنگڈا میں رہے۔ آخر وطن واپس چسے گئے، پرموں ایک پاکستانی جیو کینی کے لندن دفتر کے مینجر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا میں نے تو سارا عمل پاکستانی رکھا ہے۔ ہم نے کہا ساتھ

لاتے ہوں گے آپ۔ جیسے سرسید اپنے نوکر کو ساتھ لاتے تھے۔ کہنے لگے جی نہیں۔ ایک مثال سنئے، میں یہاں ایک پاکستانی ہوٹل میں کھانا کھانے جایا کرتا تھا۔ ایک پرانے دوستوں سے زیادہ شائستہ معلوم ہوا۔ اس کی انگریزی بھی بالحدود تھی۔ میں نے پوچھا۔ پاکستان میں کیا کرتے تھے بولا، راجشاہی یونیورسٹی میں کچر تھا۔ موسون ایم لہم کا امتحان پاس کئے ہوتے تھے۔ کب کمال کر کے اب گاہکوں سے ٹپ لیتے تھے اور ان کو تھینک یو کہنے پر مجبور تھے۔ میں نے کہا۔ جلدی بڑی پلٹنی میں نوکری کرو گے؟ بولا ضرور کروں گا۔ بلا خواہ بھی کروں گا۔ مجھے یہ لہم سکھا دیجئے میں نے اسے اگلی صبح آنے کو کہا اور اب وہ میرے ان خاصا کام کر رہا ہے۔ کوئی دن میں آفیسر گریڈ میں چلا جائے گا۔

اگر یہ بات ایشیا رکھے تو یہ ایشیا رکھیں سے تو شروع ہونا چاہیے۔ اوپر سے نہیں تو نیچے سے۔ نیچے سے نہیں تو اوپر سے۔ بات پھر چین کی آگئی۔ کہتے ہیں چینی انجینئر اور سائنسدان جوامر کیا اور یورپ میں پیش قرار آمدنی کے مالک تھے۔ اس پر لات مار کر اپنے وطن آگئے وہاں جیسی دوسروں کی اوقات ویسی ان کی۔ بنگ بلیٹس بٹیک نہیں ہیں۔ نہ لمبی کاروں کی ریل ہیں ہے نہ اونچے محل حویلیاں ہیں لیکن مرنے سے گزر کرتے ہیں۔ تھی تو ان لوگوں نے ٹائڈ راجن بم بنایا۔ ہم زیادہ سے زیادہ تانگے کا بم بنا سکتے ہیں۔

یہ ملک برطانیہ غلطی — ہمارا پرانا آقا جس کے قدموں تلے کبھی دھرتی دہتی تھی، آج کا امن مارکیٹ کی مہر کی لئے عرضیاں دیتا پھر تک ہے اور فرانس جیسے ملک اُسے دُعا بتاتے ہیں لندن کے چہرے کا فروغ اگر قائم ہے تو فورسٹوں کے بل پر۔ یہاں کے بڑے بڑے اسٹوروں کے

خریداریاں کے مقامی لوگ نہیں بلکہ سیر و سفر پر باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ خود ہم نے ایک دکان سے آٹھ دس ٹانیاں خریدی ہیں۔ ایک جگہ سے سوٹ خرید کر برطانیہ کی معیشت کو تھوڑا استحکام بخشا ہے۔ اور اس ملک کی مزید مدد کے لئے کل ایک ساتھ کئی جوڑے جرابوں کے اور ایک جوتا خریدنے کا ارادہ ہے کیا کریں اس ملک سے ہماری پرانی سیاسی اور ثقافتی یادداشت ہے۔ مصیبت کے وقت ہم اس کے کام نہ آئیں گے تو اور کون آئے گا؟



بیان لذت آوارگی کا

لندن میں آج کل جیپی وٹوں HIPPIES نے زور باندھ رکھا ہے یوں تو یہ خدائی
 خوار کہاں نہیں ہیں لیکن لندن ان کو زیادہ مرغوب معلوم ہوتا ہے۔ یہاں پکا ڈلی سرکس اور ریڈیاٹور
 سکویران کے خاص ٹھکانے ہیں۔ اتوار کی شام ہینڈ پارک پر بھی پورٹ کر رہے ہیں۔ بال بال
 کپڑے چمک۔ دائریاں پریشان۔ پاؤں رکھتے ہیں کہیں اور کہیں پڑتا ہے۔ زیادہ تر جوئے۔
 ایک لڑکا اور ایک لڑکی لگوں میں گھسیاں۔ انہوں میں پھول۔ گل اسے محبت۔ مانگتے ہوئے،
 کھاتے ہوئے۔ جہاں جی چاہے سکرٹ مار کر بیٹھے گئے یا بیٹ گئے۔ بچے ہوتے سکرٹوں کے ٹکڑے
 اٹھا کر پیئے گئے۔ کسی نے پھولدار چھینٹ کا فرغ بن رکھا ہے۔ کسی نے روٹی کی بندھی۔ لگے
 میں مالا بھی ہے اور آنکھوں میں سستی بھی۔ شراب کی سی نہیں چاندو کی سی۔ بہت سے خدرستی بھی
 رکھتے ہوں گے۔ تو جہاں کے لئے جیسے بنا رکھا ہوگا۔ لیکن زیادہ ترک دار سٹکی اصل معلوم
 ہوتی ہے۔ آپ اسے ذہنی روگ کہہ لیجئے۔ لوگ انہیں دیکھتے ہیں اور فرے لیتے ہیں۔ نوجوان
 لڑکے اور لڑکیاں ان کی طرف کھینچتی بھی ہیں۔ بعضے ان پر نفیر کرتے ہیں۔ بعضے ہمدردی جاتے
 ہیں۔ اچھے اچھے گھروں کی لڑکیاں ماری ماری پھر رہی ہیں۔ بعضوں کے نزدیک یہ اس معاشرے

کا تو عمل ہے جو اس درجہ سرگشتہ، خمار، روم و قیود تھا کہ باب گھر کے اندر بھی شام کو کھانے پر بیٹھا تھا تو باقاعدہ ڈنر جلیٹ زیب تن کر کے۔ حمد و کٹوریہ کی اخلاق پرستی مشور ہے۔ ہم نے اس صدی کے آغاز کے لباس میوزیم میں دیکھے۔ عورتیں یہ لمبے لمبے پنٹی تھین گے کے اوپر تک بٹن بندہ تھے اور پیرا بن بھی خوب بجا رہا رہتے تھے۔ سودا بکاس قطع و برید کے بعد مٹی اسکرٹ تک پہنچا۔ یہی قطع و برید معیار اخلاق میں بھی ہوئی۔ پہلے ڈانے میں سر بازار چہا چائی کا ایسا دستور نہ تھا۔ جیسا آج ہے۔ وہی لندن ہے جس میں آج ہنسی لڑکیاں اپنے کاروں پر یہ بیچ لگاتے پھر رہے ہیں۔

I AM FEELING SEXY (..... لینا کہ چلی میں)

I AM VIRGIN (میں کنواری ہوں۔ یعنی آبل بھے مار)

I AM FOR FREEDOM OF SEX (اتھالے جو بڑھا کر اٹھ)

I AM AN L.S.D. ADDICT (میں نشے میں ہوں)

I AM A PSYCHIATRIST, -

LIE DOWN (میں نفسیات کا ماہر ہوں، سیدھی لیٹ جاؤ)

یہ بیچ ڈیڑھ شلک میں جڑ جکتے ہیں۔ پکاؤں میں ڈر لینا گرا سکوار میں، ماربل گریچ پر، ٹائٹم کورٹ وڈر گنڈے رہنا ان نماز خرابوں کا شیوہ ہے۔ بعضے ننگے پاؤں رہتے ہیں۔ آنکھیں میل، دانت میلے اور عورتو جھاڑ بنا ہوا۔ مردوں کی دائریاں ایک سے ایک نرالی دھج کی۔ دائرہ می اب ولایت میں آوارگی کے سامان میں شامل ہے جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں نیاں دائرہ می دلسے ہو کر یہ حرکتیں کرتے ہو۔ میاں یہ کہا جاتا ہے: دائرہ می نڈے ہو کر یہ آوارہ پن ہنرم تر نہیں آتی ہ

جو لوگ ذرا پڑھنے خیال کے ہیں۔ دانتوں میں انھیں دلبے کہتے سنا دیتے ہیں کہ یہ کیسا زمانہ
 آن لگا ہے۔ کیوں ان جھوکیوں کے دینے سے شرم ہو رہا ہے۔ ڈیڑھ ٹی ٹران میں ڈھکس کیورڈن نے
 ایک مضمون لکھا ہے۔ دوشیزائی کی حالت میں اس کا کتنا ہے کہ جنسی جذبات کا اہال تو ہمیشہ ہر زمانے
 میں عورت مرد میں انتشار ہے۔ لیکن لگے زمانے میں بے راہروی کے مواقع کہتے۔ اب تو خود
 کمانے والی لڑکیاں آزاد ہیں۔ ان پر کوئی چاہے بھی تو کیسے پہرہ رکھ سکتا ہے۔ ہر آفت سے بچانے
 کے لئے گولی ہے۔ تحریریں کے لئے موٹر مائیکل ہے۔ اسپورٹس کار ہے۔ بولنے فریڈ کے ساتھ
 گھر سے بلکہ ملک سے باہر جا کر چھٹی نسل کی آزادی ہے۔

گر ہو شراب و ماغزوہ محبوب خبر و
 زامد تجھے متم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

ادھر نوجوانوں کے لئے بے شمار مواقع ہیں کسی بھی دوشیزہ کو اپنی راہ پر لانے کے۔
 بس ذرا تلیسی سوچیں ہوں۔ رپے پیسے کی بھی شرط نہیں۔ کیونکہ لڑکی خود کمانی ہے۔ ادھر
 لڑکی کو روکنے والی کوئی چیز نہیں۔ دوسروں کو دیکھ دیکھ کر اس کی ذہنی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے
 کہ اگر کوئی پار کرنے کے لئے اس کا طالب نہیں ہوتا تو وہ نکو بنتی ہے۔ خود کو ہم چشموں کی
 نظر میں حقیر محسوس کرتی ہے جہاں سات سیلیاں مٹی ہیں اور اپنے معاشقے بیان کرتی ہوں وہاں
 اس کا احساس کمتری میں مبتلا ہونا قدرتی بات ہے۔

کیورڈن صاحب نے وعظ کرتے ہیں نہ قرب قیامت کی فریاد دیتے ہیں ان کی دانی یہ ہے
 کہ بارہ کچھ لڑکیاں تو ایسی ہوں گی جو اپنی عصمت بچانا چاہتی ہوں گی اور شرفیاد شرطوں میں شادی کا
 انتظار کرنا چاہتی ہوں گی۔ پڑھنے زمانے میں ایسی لڑکیوں کو اس خیال سے تعویذ دے رہی تھی کہ معاشرے
 کا اخلاق ضابطہ ان کی پشت پر ہے۔ ان کو بظرف تمہیں دیکھتا ہے۔ آج ایسی کوئی روک نہیں۔

معاشرہ انہیں سراہے گا تو کیا عجیب نظریے دیکھتا ہے کہ یہ کیسی لڑکی ہے۔
یہ اکثر نام بیٹا ہے خدا کا، اس زمانے میں

Are we the last married generation?

ہندوئے آبزرور نے بھی ایک بڑا چوڑا مضمون چھاپا ہے۔ "کیا شادی کا رواج ہماری نسل کے ساتھ ختم ہو جائے گا؟ یعنی آئندہ لوگ راکریں گے میاں بیوی کی طرح لیکن شادی کی کھٹیڑ میں اٹھائے بغیر" آبزرور نے اُسے دلے دُور کی دھندلی سی یہ تصویر دکھاتے ہوئے اس کی وجہ بیان کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شادی کی جاتی تھی معاشرتی اور اقتصادی تحفظ کے لئے عورت شادی نہ کرتی تو لکائی کہاں سے؟ شادی کے تصور کو کچھ تقویت مذہب سے ملتی تھی اور کچھ مادی مادیوں سے۔ اب لوگوں کی عمریں لمبی ہو گئی ہیں۔ ایک ساتھی کے ساتھ اتنی بڑی جنسی زندگی گزارنا دشوار ہے۔ لڑکے لڑکیاں اب بوخت کو بھی جلد تر پہنچتی ہیں اور شادی سے پہلے جنسی تجربہ اب ایک قدرتی اور مستقر بات گئی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جو شادی کے بعد مکمل جنسی ناواری کی توقع کرتے ہیں نہ اُسے اہم مانتے ہیں۔ اب شادی عورت کا معاشی سہارا بھی نہیں۔ وہ خود جو کماؤ ہے۔ نئے داغیہن اسحاق (ایکس کمفرٹ دیگرہ) کا کہنا ہے کہ ایک مرد یا عورت اپنے شریک زندگی کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے سے بھی خفیہانہ محبت کر سکتا ہے یا کر سکتی ہے۔ اس پر بے وفائی کی کوئی بات نہیں۔ دونوں سے وفا ممکن ہے۔ ظاہر ہے اس داغیہن کے تصور عشق میں جنسی واردات بھی شامل ہیں۔

اس سلسلے میں آبزورو کے مضمون نگار نے بہت سے جوڑوں سے انٹرویو بھی لئے۔ ان میں ایک صاحبہ دیرپا اور تھک چکی ہیں۔ عمران کی چوبیس برس ہے اور ایک بچہ ہے پانچ سال کا۔ ایک دفتر میں سیکرٹری ہیں۔ شادی ان کی اب تک نہیں ہوئی۔ ان کا کہنا ہے کہ میں ۱۹ برس کی تھی جب اسٹوارٹ پیدا ہوا۔ میں نے گھر سے جاگ کر نوکری کرنی اور اب ایک لڑکی کے ساتھ ایک فلیٹ میں رہتی ہوں۔ میں نے اسٹوارٹ کے باپ سے شادی کرنے کا کبھی سوچا بھی نہیں۔ وہ اچھا شوہر بھی ثابت ہوتا۔ کبھی بچہ پوچھتا ہے کہ اتنی میرا باپ کوئی کیوں نہیں؟ میں جواب دیتی ہوں اس لئے کہ اتنی نے شادی ہی نہیں کی۔ وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ میرے بڑے فریڈ نے بڑے خوب گھڑا رہتا ہے۔ ایک روز میں ایک عورت نے کہا۔ کتنا پیارا بچہ ہے بیٹے تمہارے ابو تو تم پر بڑا نماز کرتے ہوں گے۔ اسٹوارٹ نے جھٹ کہا۔ میری امی کی شادی ہی کہاں ہوئی ہے؟ وہ بچہ پوری حد سے بے ہوش ہو جاتا ہے۔

میں اور تھک چکی ہیں کہ میں اپنی زندگی سے ناخوش نہیں۔ میرے مرد دوستوں کی طرف سے دوبارہ شادی کی پیشکش بھی ہو چکی ہے۔ میری وہ سیلیاں جو جلدی میں شادی کر چکی ہیں۔ میری زندگی پر رشک کرتی ہیں۔

پس چہ بایہ کرد اسے اقوام شرق۔ مغرب میں تو محبت اور شادی دونوں کا جو راسم ہوا جاتا ہے۔ امریکن پہلے سکولز میں درجنوں ایسے یونیورسٹی کے طالب علم جوڑوں کی تصویریں بھیجیں ہیں جو بن بیاہے میاں بیوی کی طرح رہتے ہیں۔ اب ادب میں بھی گا زور دی کے سب کے درخت کی میرٹھیں نہ ملیں گے۔ دنیا میں ٹھل ٹھل کے مرنا جینا دونوں متروک ہوئے ترے کو چہ ہر ہانے جس دن سے رات کرنا۔ کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا۔ مغرب والوں

کے نزدیک یہ شربے معنی ہے۔ آج کے شاعر کا چاند بالائے نام نہیں ہے اس کے پہلو میں ہے
 نہ عہد و ہمایاں نہ شکوے شکایت۔ نہ بے مہری جاناں نہ سیاست و رہاں۔ ہستی لوگ ذرا زیادہ
 انتہا پسند نہ مفاہروسی لیکن سارے آدھے کا یہی حال ہے۔

ہی یورپ میں تو اب ایجاد ہوتے جہازے ہاں صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔ ہم ناخن ان
 کا تماشا کرنے اتنی دُور آتے، پکا ڈلی سرکس میں اپنی شاہیں خراب کیں۔ یہ پریشاں گیسٹوں بے چرخوں
 جہازدار وارٹھیں۔ میلے کرتوں اور بلی ماؤں شکوں، کٹکڑیوں، گٹھنیوں، ناٹوسوں، تعیذوں
 ولے جہازے ان کیا کم ہیں۔ اپنے وطن میں سب کچھ ہے ہمارے۔ کس پرز کی کمی ہے۔ بولا ہری
 گل میں۔ جنگ گشتی ہے۔ چاند کا دم گتا ہے۔ کوڑی سوٹے کے گھنگر دہکتے ہیں۔ سبزی
 کے جام تقسیم ہوتے ہیں۔ ہوتی، ہوتی، گئے دم سے غم۔ شاعر نے ان پھندروں کا نقشہ یوں
 کھینچا ہے :

پھرتے ہیں یوں شہر کے اندر

اُگے کتے، پیچھے بندر،

دم مولا دم مست قلندر

ان میں بھٹے بے اولادوں کو اولاد بنشتے ہیں۔ جذمتی رکو کر تنگ دھڑلے پھرتے
 ہیں۔ پھولیں مار کر قندے جاتے ہیں، بھٹے تو ہنڈیا میں ڈال کر روپے بھی دگنے کر دیتے
 ہیں۔ سرکاری کسٹل یا اسٹیٹ بنک جانے کی حاجت ہی نہیں۔

ہر فرد امد ہرزمانے کا ایک فلسفہ ہر تلبے۔ جب تک انسان پتھر پر پتھر مار کر آگ جلاتا

تھلا اور سوچے ہرن یا بیل کو آگ پر جھونتا تھا۔ یہ انیم بم، کمپیوٹر اور غیر ملکی ذریعہ ہمارے کے ٹھٹھے نہیں تھے۔ تب تک ہر جگہ امن اور شانتی تھی، لوگ مراقبوں میں جاتے۔ تپسیا کرتے اور اپنی ذات کو رفعت بخش کر بڑے اعلیٰ انسان سے اپنی اپنی قبر میں چلے جاتے۔ ہر مقبول استاد ذوق، خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، کاکل بڑھے، گیسو بڑھے یعنی آبادی بڑھی۔ حرص بڑھی، جوع الارض بڑھی۔ لوگوں نے علم سے کار ایسی یٹا شروع کیا۔ اور بات تیر و تہرے ہوتے ہوتے ایڈر و جن بم اور مزارتوں تک پہنچی۔ تپسیا اور آفتاب کے زمانے گئے۔ اب کسی آدمی کی ذاتی نیکی اور آفتاب بے معنی چیزیں ہیں۔ ع

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

ایک یورپین ایک روز جہادی روحانیت کی تعریف کر رہا تھا۔ ہم نے کہا۔ اے بھیا ہمارے ساتھ سودا ملے کرے۔ یہ روحانیت تو سہل ہے۔ ہم تجھے اپنے صوفی بھی بخشے ہیں تصوف کی دولت بھی تیری قدر ہے۔ ہمارے ہاں شاعر بھی بڑا بڑا پڑا ہے۔ وہ بھی سپردِ مہم ہو یا نہ خوش را۔ یہ سب سہل ہے تو اپنی رنج کی پاکیزگی کا اہتمام کر۔ اتنے میں ہم تیرے ٹریکٹر تیری یلین۔ تیری عرقیں تیرے ٹیکسیکل کالج اور تیرا زرد مبادلہ استعمال کرتے ہیں۔

ہمارا نسخہ مشرق و مغرب کو حتی الوسع ہم سچ کرنے کے لئے یہی ہے کہ ہم اپنا تصوف مع توانوں کے اور اپنی شاعری مع اس کے سوز و گداز کے کمپیوٹ کریں اور مائنس اور پلس کو جی وڈا کریں۔ کچھ ان لوگوں کی رفتار سست ہو کچھ جہادی تیز ہو جب برابر آجائیں گے تو سوچیں گے کہ اب کیا کرنا ہے۔ حضرت خلیفہ جالندھری نے فرمایا ہے۔

اں سے غیر کجی درو کی دولت یا رب
ایک میرا ہی صبا ہو کجے منظور نہیں،

نعتِ عاشقاں سے گھمکول شریف تک

جانے لوگ ان گیوں کو چوں کہ نام گارڈن جگہ گارڈنز کیوں رکھتے ہیں جہاں ایک پتی بنے
 کی نہیں جوتی۔ کوئٹہ گارڈن کے سامنے تو خیر باغیچہ ہے۔ خاصا بڑا ہے۔ ہمارے گھر کے لان
 سے بھی بڑا، لیکن پورچسٹر گارڈن وغیرہ نام تو لوگوں کو سبز باغ دلانے کو رکھے گئے ہیں۔
 ایک اور بات یہ کہ ہمارے ان پارک چھوٹی سی چیز جوتی ہے، جیسے اوڈنک زیب پارک۔
 اس اسٹنگ پارک وغیرہ۔ لیکن گارڈن بڑا ہوتا ہے۔ برنس گارڈن لارنس گارڈن وغیرہ یہاں
 اس کے آٹھ ہے۔ یہاں پارک بڑے جوتے ہیں۔ شتا اینڈ پارک۔ ریجنٹ پارک وغیرہ۔
 جانے کیوں یہ الٹی انگلی بنائی گئی ہے۔ پھر یہاں کے پتے پریشان کرتے ہیں۔ ایک نام سے لیجئے
 شتا اینڈ۔ ایک تو اینڈ روڈ، جوتی۔ پھر اس میں اینڈ گارڈن ہو گا۔ اینڈ اسٹریٹ ہو گی۔

اینڈ پلیس ہو گا۔ اینڈ سکوائر ہو گا۔ اینڈ ہاؤس۔ اینڈ روڈ۔ اینڈ میوزیم بھی ہو گی
 جو پرانے زمانے کے مصطلحوں کی کڑیاں بنائی گئی ہیں اور اس پر اتفاقاً نہیں اس میں کوئی جھلا
 مانس اپنے مکان کا نام اینڈ ہاؤس رکھ کر رکھے گا۔ اینڈ کیفے۔ اینڈ لاج۔ اینڈ ہاؤس وغیرہ۔
 جہاں ایک جگہ داروگ گارڈنز کا پتہ دیا گیا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہر طرف داروگ ہی داروگ ہے

کوئی یونیورسٹی ہے تو کوئی یارڈ ہے، کوئی اسکول ہے۔ تو کوئی گارڈن ہے۔ جو کئے یا رے نکلے
تو سوئے دار چلے۔ قیامت یہ ہونی کہ داروگ گارڈنزدو ہیں۔ ایک لندن ۷۵ میں بھی ہمارے
قرب، ایک لندن ۱۶۵ میں خاصی دُور۔ آخر تنک بار کر جم واپس آگئے۔ پیرس میں بھی
یونیورسٹی دار۔ پلیس وغیرہ کے چکر بست ہیں۔ اور ہمارے ان بھی روڈ، اسٹریٹ، بازار
کوچہ۔ گلی وغیرہ کا سلسلہ ہے لیکن انگریزوں کا مقابلہ نہیں۔ خدا جانے یہ لوگ اپنے گھر
کیسے تھکن کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اسٹیشن کے بٹال پر ایک کتاب ہے۔ لغات عاشقان

THE LOVER DICTIONARY

بعد میں یہی کتاب لندن کے مشہور اور ایک دعوے کے مطابق دنیا کے سب سے بڑے

کتاب فروش فوئل کے اب بھی پائی۔ یہ ایک ہدایت نامہ ہے۔ درخواست SEDUCTION
کے لئے سرورق پر جا بجا بنوں کے بوسوں کے گھوٹی نقوش ہیں اور اندر گفتگو کی صورت میں ٹوٹکے
دیئے گئے ہیں، پانچ مختلف زبانوں میں۔ اس کتاب کی مدد سے انگریزی، فرنیچ، جرمن، اٹالین اور
ہسپانوی زبان میں کسی اجنبی لڑکی سے اظہار عشق کیا جاسکتا ہے۔ اس کا جواب حسب مراد ملے یا
پہلے سے مرمت ہوتی ہے۔ اس کی ذمہ داری مصنف قبول نہیں کرتا۔ نمونہ کلام :

•۔ جہاز میں سفر کرتے ہوئے :

”ارے میں کہاں آگیا۔ مجھے سوتے میں چلنے کا مرض ہے“

”میرے کہن سے سمندر کا نظارہ زیادہ اچھا ہو سکتا ہے۔“

ہوائی جہاز میں :

”میں ذرا آپ کا ہاتھ پکڑ لوں۔ جب جہاز اڑتا ہے۔ تو میں گھبرا جاتا ہوں۔“
 ”یہ سیٹوں کے درمیان کا فاصلہ نکال میں تو زیادہ آرام رہے گا۔“

گاڑی میں :

”بتی بھبادوں؟ میری آنکھوں کو روشنی سے تکلیف ہوتی ہے۔“
 ”صاف کیجئے۔ یہ پانچ پونڈ کا نوٹ آپ کا معلوم ہوتا ہے۔“

سائل پر :

”اسے میں سمجھا آپ بے ہوش ہو گئی ہیں۔ اس لئے مصنوعی تنفس دے رہا تھا۔“
 ”میں آپ کے تیراکی کے سوٹ میں سے ریت نکال دوں؟“
 ”میں تو یہ پکڑ کر اڑتا ہوں آپ کپڑے بدل لیں۔۔۔۔۔“

سینما میں :

”سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھیں۔ وہاں سے اچھا نظر آتا ہے۔“
 ”ادھر میں سمجھایہ میری کرسی کا ہتھا ہے۔“
 ”میرا دوستانہ آپ کی ٹانگوں کے اُس پاس گر گیا تھا۔“

پٹے فیسٹ میں :

”میں بتانا بھول گیا تھا کہ میرے والدین یکایک گاؤں چلے گئے ہیں۔
 • پتہ نہیں بلب کا فیوز کھینچے اڑ گیا۔
 • یہ کمرے کو تالا کیوں جام ہو گیا۔“

اُس کے فیسٹ میں :

”تھک گیا ہوں۔ ذرا ریٹ جاؤں۔ آپ بھی یہاں آرام کر لیجئے۔
 (اُس کا میاں آہلئے تو)
 • میں بھی والا ہوں۔ میٹر دیکھنے آیا تھا؟“

ہوئی میں :

(لفظ کوئی بھی فرض نہیں لیکن کوئی فقرہ نقل نہیں کیا جاسکتا)

اس کی والدہ سے :

”میں نہیں مانتا آپ اس کی والدہ ہیں۔ اُس کی بہن ہوں گی آپ ...“
 ”چھپا چھڑانا ہر تو“۔ سمات کی بجائے میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ میری بیوی اس پر
 رضامند نہ ہوئی۔“

کچھ مفید مطلب کھات

”تم اتنی خوبصورت ہو کہ میں تمہائی میں اپنے پر اعتبار نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ اے میری زندگی کی روشنی۔“ اُسے ملکوتی چہرے والی۔ ”تم راحیوں پاگل کر دینے والا ہے۔“ ”تم دوسری عورتوں سے الگ ہو۔۔۔۔۔“ ”رسموں کے جھگڑے میں نہیں پڑا کرتے۔“

۳

ساتھ کنسلٹنٹس میں برائی کتابوں کی ایک دکان پر ایک صدی پہلے کا ایک پرچہ نظر آیا۔
(اواکیسے دکھائی جاتے)

TEASING MADE EASY

عورتوں کے لئے نصیحت نامہ:

تصویروں دکھاؤ ٹونوں کے نیچے عبارت ہے:

”عورت کو چاہیے کہ ایک دن بے سادگیاں ظاہر کرے۔ دوسرے دن چہرے پر تیرہری
چڑھالے اور اپنے کو دھڑکھینچے۔ بے رخی سے جواب دے لیکن اس بیج میں ایک انوکھی بھری
بھی ڈالے۔ رخصت کے وقت کہے۔ خدا حافظ اے خالم۔ اگلی صبح وہ غرور کرتے گا۔ اس
وقت شوے بساتے۔ اس کی بانوں میں خود کو ڈال دے۔ وہ خود اپنے ناکہ وہ گناہ پر نادم ہو گا
اور معافی چاہے گا۔ اس وقت معافی دے دینی چاہیے۔۔۔ وغیرہ“

۴

انگریزی اخبار کے اشتہارات کے کالم میں سے:

”سیکڑوں برطانوی اور غیر ملکی لڑکیاں دوستوں کی ملاشی ہیں۔ پتہ ذیل پر خط لکھئے:-

لگوہن - ۵۲، اریز کورٹ رڈ، لندن

TEASING MADE EASY.

ADVICE TO LADIES.

HOW TO TEASE THE GENTLEMEN.

HOW TO GET A LOVER,

And a mass of Information on

LOVE, COURTSHIP, & MATRIMONY.



”رومانس لڑائیے ناشادی کیجئے۔ رشکیوں سے جانا ہمارا ذمہ۔ ہر عمر کی ہیں اور خوبصورت
پتہ : ۱۵۰ - بیکرا اسٹریٹ۔ لندن

ہمارے کلب کی خواتین ارکان کے لئے مردوں کی خدمت ہے۔
پتہ : ۷۴ - امرسٹ پارک۔ لندن

”آپ امید سے تو نہیں ہوئیں؟ ہم سے معاہدہ کرایئے۔ فیس دو پونڈ۔ معامت صیغہ راز
میں رہے گی۔ پتہ : بیل چکسٹر ۴ - چارلٹ روڈ۔ لندن

۲۵ سال کے ایک نوجوان کو عورت چاہیے۔ ۲۵ سے ۴۴ سال تک کی۔ کنواری ہو۔ بیوہ ہو۔
 حلقہ یافتہ ہو۔ کچھ پروا نہیں۔ مقصود دوستی ہے۔
 بکس نمبر ۲۵۱

برطانوی کنواری عمر چالیس سال۔ کسی ہندوستانی۔ ایشیائی، ایفرو ایشیائی لڑکی سے دوستی
 چاہتا ہے۔ عمر ۲۵ تا ۴۵ سال قابل قبول ہے۔

ایک خانقاہ کا تربیت یافتہ پادری عمر ۲۹ سال۔ اعلیٰ ڈگری یافتہ۔ شرمیلہ۔ ایسی عورت سے
 بحث پٹ یاراد چاہتا ہے جو مازکو راز رکھے۔

اور دوسرے سرے پر :

لندن کے ایک اردو اخبار میں اطلاع عام :

کاونٹری (انگلستان) گھمگول شریف کوٹا کی خانقاہ نقشبندی کے سالانہ عرس کے
 موقع پر ۱۷ اکتوبر کو صبح دس بجے جامع مسجد کاونٹری واقع ایگل اسٹریٹ میں ایک روحانی
 تقرب منائی جائے گی۔ جس میں نعت خواں اور صلئے کلام شرکت کریں گے۔
 سجادہ نشین آف موہڑہ شریف بھی عوام سے خطاب کریں گے۔ عادت کے مسلمانوں سے
 شرکت کی درخواست ہے۔

ہائے بشیرا، ہائے بشیرا

ہمارے دوست تید سبط حسن آج کل لندن میں ہیں۔ بابل نینوا اور بعلبک وغیرہ کے خوابوں کی خاک چھانتے یہاں پہنچے ہیں، معلوم ہوا کہ ٹیلی ویژن کے اشتہاری پروگراموں کی تکنیک کا مطالعہ کر رہے ہیں، ہم سے ملاقات ہوئی تو ہم نے پوچھا کیسے کیسی گزرتی ہے۔ بولے، 'بشیرا یاد آ رہا ہے، ہم نے کہا، یہ کون بزرگ ہیں؟ بولے، 'اے بھائی اپنا بشیرا جو ہمارا حقہ بھرتا ہے، ہمارا بستر لگاتا ہے، ہمارا جوتا پاش کرتا ہے، علی الصبح چلتے بنا کر دیتا ہے، ہمارے مکانوں کے لیے پان سگریٹ لاتا ہے، دھوبی کے ہاں کپڑے دے کر آتا ہے، اور پھر لاتا ہے، گھر کے لیے سبزی گوشت آنا دال سبھی کا ذمہ دار ہے۔ ہمارے گھر میں اصل چیز تو وہی ہے، ہم تو دراصل ہیں۔ ہمارے بغیر ہمارے گھر کا گذارا بخوبی چل سکتا ہے۔ بشیرا کے بغیر نہیں!

تب معلوم ہوا کہ اپنے ایک دوست کے ہاں مقیم ہیں اور اخلاقاً ہر روز صبح کو پورے گھر کے برتن دھوتے مانجھتے ہیں۔ یہ ان کا خاندانی پیشہ کبھی نہیں رہا۔ لہذا ہاتھوں میں گٹھے پڑ گئے ہیں ان پر تیل لگاتے ہیں اور ہاتھ دھو سکتے ہیں چونکہ ان کے

دوست ہسپتال چلے گئے ہیں لہذا انھوں نے فرمایا تمہارے پاس جگہ ہو تو رہم بھی آجائیں۔ ہم نے کہا بسم اللہ۔

سید سبط حسن کے ہمارے مکان میں آجانے سے پہلے ہمیں دھوبی نائی کی بڑی دقت تھی، اب نہیں رہی عین نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنے کام کے آدمی ہیں۔ ہم نے اپنے رومال اور ایک دو بنیائے دھونے کو نکالے تو بولے، کیوں اتنی زحمت کرتے ہو، میرے تھیلے میں ڈال دو، میں تھوڑی دیر میں گھاٹ پر جلنے والا ہوں، ہم نے کہا، گھاٹ؟ آپ جا کر یہ کپڑے دھوئیں گے؟ چھو اچھو کریں گے؟ انھوں نے کہا اُس سے آپ کو کیا مطلب۔ آپ اپنے کپڑے اس تھیلے میں رکھیے اور میں یہ لادوی لیے جاتا ہوں۔ دوپہر تک آپ کو دھلے دھلے کپڑے مل جائیں گے۔ تب معلوم ہوا کہ وہ پڑوس میں ایک لائڈریٹ دیکھ گئے ہیں، یہ ایک دوکان ہوتی ہے جس میں کپڑے دھونے کی مشینیں قطار در قطار رکھی ہوتی ہیں آپ خود ہی مشین میں کپڑے ڈالیے۔ صابن ڈالیے اور ایک سو راخ میں سکے ڈالیے۔ مشین ایک نیڈل گھمانے سے چلنے لگے گی۔ دہاں سے نکال کے دوسری مشین میں رکھیے اور ایک اگتی ڈالیے، وہ ان کو پوری طرح نچوڑ دے گی۔ قیسری میں ڈالیے تو چھپس میں سکھا دے گی۔ افسوس ابھی تک ایسی مشینیں نہیں نکلیں کہ چھپس کا سکہ لے کر کپڑے استری بھی کر دیں۔ لیکن اس کے لیے سید صاحب ایک جیبی استری لے گئے ہیں جب ذرا گر دن جھکائی کپڑا استری کر لیا۔

کچھ دن سے ہمارے بال بڑھ رہے تھے سید صاحب نے کہا، تم نہ ہتی ہو نہ اننگ پوئل ہو کو تمہارے بال کاٹ دوں پالا ہو میں شاکر علی ہمارے بال کاٹ دیا

کرتے تھے ہم اُن کے۔ ہم نے کہا شاکر علی صاحب کی اور بات ہے۔ اُن کے سر پر بال ہی کتنے ہیں۔ مجھے معاف رکھیے، کسی نائی کا پتہ بتا دیجئے۔ تب انھوں نے ہماری رہنمائی کی میٹش کسٹ کی۔ ایک نائی کے اُس سے گئے جہیں اُس کی کرسی پر بٹھا یا اور خود اخبار پڑھنے لگے، لیکن ابھی سرخنی آدھی ہی پڑھی ہوئی کہ نائی نے کہا: بس جناب ہوگئی حجامت! اب لائے چھ شنگ دیجئے۔ اُن صاحب! اب کس کی باری ہے؟ آئیے۔ ہماری حجامت ہونے میں محارم کے لحاظ سے بھی اور دیسے بھی دو منٹ سے زیادہ نہ گئے ہوں گے۔ اس بندہ خدا نے ایک کنگھا اٹھایا اور ایک بھلی کی مشین۔ شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا، پھر کچھ معلوم نہ ہوا، یہ بات جہیں کچھ پسند نہ آئی کیونکہ آٹھ شنگ جمع دو شنگ بخشش سے قطع نظر جو ہمیں طوفاؤر آدینی پڑی اور جسے لے کر اس شخص نے سلام تک نہ کیا، جہیں ہر سب کچھ حجام کی دوکان کی روایت کے خلاف لگا۔ ہم نے الفیلز میں بوبک حجام اور اس کے بھائیوں کے قصے پڑھ رکھے ہیں۔ ان کی نسل تو اب ناپید ہوئی تاہم کراچی میں جن خلیفہ کے آگے ہم سر جھکاتے ہیں وہ بھی کم از کم ہم سے عرب اسرائیل کے مسئلے، آٹے وال کے بھاؤ، نئی نسل کی بے راہ روی اور مذہب سے دوسری اور روس اور امریکہ کے گٹھ جوڑ پر ضرور گفتگو کرتے ہیں۔ پیچھے کے بال مشین سے اور آگے کے قینچی سے کاٹتے ہیں۔ استرے سے قلیں بناتے ہیں۔ پھر آگے پیچھے سے شیشہ دکھاتے ہیں، بالوں کی گھپی کرتے ہیں۔ کنگھا کرتے ہیں ان کا ریٹ تو ایک دریا ہے لوگ چار آنے ٹپ بھی دے دیتے ہوں گے لیکن سیر حشمتی ہماری طبیعت میں داخل ہے اس لیے ہم بال لٹا کر اپنی جیب سے حاتم کی قبر نکال کر پہلے اسے شوکر مارتے ہیں پھر اسے ڈیڑھ دریا دیتے ہیں۔

وہ خوش ہو جاتے ہیں اور دوسرے ہو کر سلام کرتے ہیں۔ اس لندن کے نائی نے تو ہمارے بال تک نہیں بھاڑے۔ ایک تولیہ ہماری طرف پھینکا کہ بھاڑ لیجئے۔

سید بسطاحی کو سوا درودۃ العبری میں جو دلی یا دآئی یعنی لندن میں بشری کی تقد معلوم ہوئی تو اس کی وجہ یہی ہے کہ یورپ میں بشری قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ دفتر ہو یا گھر۔ آپ خود ہی اپنے چراسی، خود ہی اپنے چوکیدار، ابدار، خاصہ خانہ دار وغیرہ۔ اور گھر کی بی بی خود ہی اپنی آیا۔ پھوپھ، منگانی، اتا، میراسی، دھوبن اور ماٹن ہوتی ہے۔ افسر خود ہی فائل پر جو کچھ لکھتا ہے لکھ کر دوسرے کمرے میں دوسرے اہل کار کو دینے جاتا ہے پھر والا اور گھروالی دونوں اپنا سوا خود لاتے ہیں خود پکاتے ہیں اور خود ہی برتن مانجھتے ہیں، بھاڑ دے کر گھر کی صفائی کرتے ہیں۔ اس عظیم میں انگریز آتا تھا تو بیاں کی گرمی کے باوجود اگر واپس نہ جاتا تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ اس کے اشارے پر دس آدمی بکوس باندھے خدمت کو بھاگے آتے تھے۔

سید صاحب کو ہم نے اپنا جوتا آپ پامش کرتے اپنے پاپ کی حلیم آپ بھرتے اور اپنی قمیض کاٹش آپ ٹانگتے اور اپنی پتلوی پر استری کرتے دیکھا تو ہم نے ان سے باتا دہ معافی چاہی کہ ہم تو آپ کو بالکل ناکارہ آدمی سمجھتے تھے۔ آپ تو خالص لکھنؤ کے معلوم ہوا پٹنار بندھا بھی جانتے ہیں۔ کم از کم انڈے تل لیتے ہیں اور تو سینگ لیتے ہیں۔ گھر کے کام کاج سے بخوبی واقف ہیں اگر ان کی شادی نہ ہو چکی ہوتی تو ہم ان کے لیے کسی تعلیم یافتہ برسر روزگار لڑکی کا برتاش کرتے۔

سید صاحب کو سب سے زیادہ تکلیف، صبح کی چائے یعنی بیڈ ٹی کی ہے۔ وہ صبح صبح اٹھ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ سحر خیزی کی عادت کبھی عبادی بکھر میں نہیں آتی۔ چرند پرند کی بات اور ہے ان کے تو بستر نہیں ہوتے اور پھر ان کو اٹھ کر چوگا بھی تلاش کرنا ہوتا ہے۔ انسان تو اثرات الملوقات ہے بستر رکھتا ہے۔ خیر تو سید صاحب اٹھتے ہی ٹٹے بشر اکافروں لگاتے ہیں اور کہتے ہیں مجھے دنیا میں اور کچھ نہیں بشر اچاہیئے۔ ان سے پہلے مرزا سودا بھی اپنے قیدیوں میں حرص نامی شخصے سے کہہ چکے ہیں کہ دنیا کی ساری چیزیں تجھے مبارک، میں اور ساتھ میرے میرا بسنت خاں ہو۔ اب وہ جلد ہی کراچی کو ٹٹے دے دیں اور ہمیں ان پر رشک آ رہا ہے۔ یہ نظم بشر نامہ ہم نے انھی کے لیے لکھی ہے۔ انھی کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔

بشر نامہ

ہم نے کل جب دل کو چیرا	میر کا پایا ختم ذخیرہ
جیب میں بھی اب پونڈ ذریعہ	ہائے بشر! ہائے بشر!
جب ہم دس کانٹ دکھائیں	تب اک گوشت کا ٹکڑا پائیں
وہ بھی اونٹ کے منہ میں ذریعہ	ہائے بشر! ہائے بشر!
ساتھ چھ میں اک خر بوزہ	اٹھ روپے میں آدھا چوزہ
ڈیڑھ روپے کا چھوٹا کھیرا	ہائے بشر! ہائے بشر!
ہوٹل دوٹل ٹیکسیاں کاریں	سبھی جمادی کھل آتاریں
جہاں کے آغا خاں کا بنیرہ	ہائے بشر! ہائے بشر!

سات روپے میں بال کٹا کر
 گھاٹ پہ خود لاد دیے جا کر
 روئے بٹھے کے بھگت کبیرا
 اٹے بشیرا، اٹے بشیرا
 کون ہمارا شو چمکائے
 صبح سویرے چائے لائے
 دل اپنا بے حد د لگیرا
 اٹے بشیرا، اٹے بشیرا
 تن میں اپنے جان نہیں ہے
 منہ میں اپنے پان نہیں ہے
 کیسا زندہ؟ کون خمیر؟
 اٹے بشیرا، اٹے بشیرا
 جان بچے تو لاکھوں پائیں
 خیر سے اب ہم گھر کو جائیں
 دیکھو یا یورپ کا دھیرہ
 اٹے بشیرا، اٹے بشیرا

لندن میں ہم رہے تو بہت دن لیکن ان میں سے آدھے سوٹ کیس کو چابی گھولنے اور آدھے جو تان گھولنے میں گزر گئے۔ چابی کا قصہ یہ ہے کہ یہ سب صحن کے ایک دوست اپنا سوٹ کیس جس میں ان کے پُرانے میلے کپڑے بھرے تھے لندن چھوڑ گئے تھے اور سید صاحب سے کہہ گئے تھے کہ اسے بُک کر کے بیٹے آنا۔ دیکھا تو اس کی چابی نہیں تھی اور تالا بند نہ ہو تو ایئر ٹیکنی دے سامان قبول نہیں کرتے۔ آخر انھوں نے سوٹ کیس ہاتھ میں اٹھایا اور چابی بنوانے کے لیے نکلے۔ بازار دو تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا کبھی اس ہاتھ میں لیتے۔ وہ تھک جاتا تو دوسرے ہاتھ میں۔ ہمارے ایک ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور دوسرے ہاتھ میں اس روز کا اخبار تھا۔ ورنہ ہم ضرور ان کا بوجھ بٹاتے۔ کوئٹہ سے پراس ہمرے سے دوسرے ہمرے تک گھوم گئے۔ چلنے یہ لندن دے

کیسے لوگ ہیں جو تھے پھرے، بسکٹوں، مٹھائیوں، بھلی کے سامانی، سگرٹوں اور لاپلا چیزوں کی دوکانیں تو بہت ہیں لیکن جو سب سے ضروری چیز ہے یعنی تالوں کی کُشد چابیاں بنانا۔ بس وہی نہیں ہے۔ ایک جگہ پوچھا تو دوکاندار نے بغیر ہماری طرف دیکھے ایک طرف کو اتھو سے اشارہ کر کے کہا۔ ادھر چلے جائیے **AROUND THE CORNER** ہے۔ ہم اگلے موڑ پر گئے۔ وہاں کوئی نشان نہ ملا۔ ایک سگرٹ فروش سے پوچھا۔ اس نے کسی اور طرف اشارہ کیا۔ اور کہا **AROUND THE CORNER** آخر ایک بڑے اسٹور میں گئے وہاں معلوم ہوا کہ **KEY CUTTER** یعنی چابی بنانے والا ہے۔ اس نے سوٹ کمپس کو دیکھتے ہی سر ہلادیا کہ جناب ایسی چابی نہیں بن سکتی۔ وہاں سے ہم انڈر گرؤنڈریل کے سٹیشن پر پہنچے اور آکسفورڈ سٹریٹ پر اتارے۔ وہاں **WOOLWORTH** کے ہاں دینا بھر کی چیزیں اور دینا بھر کے کام ہوتے ہیں۔ وہاں ایک مثال پر لکھا تھا کہ یہاں تالے کی چابیاں بنائی جاتی ہیں اور جوتوں کی ایڑیاں لگائی جاتی ہیں۔ ہم نے کہا :-

”حضرت اس کی چابی بنا دیجئے؟“

اس نے کہا :- ”جی مجھ سے نہیں بنے گی اس کی چابی۔ میں تو مکانوں کے دروازوں کی چابیاں بناتا ہوں۔“

ہم نے کہا :- ”اچھا تو ہمارے جوتے کی ایڑی گھس گئی ہے یہ لگا دیجئے۔“
ہم نے سوچا بھلا گتے چمڑکی لٹکائی ہی تھی لیکن اس نے اس کے لئے بھی معذرت کر دی اور کہا کہ ایڑی تو گھس ورنہ کٹاپ ہی میں لگ سکتی ہے۔ کسی جوتے والے کے ہاں جاتیے۔



اب چابی کی طرف سے یا کس ہو کر ہم نے جوتے دونوں کی دکانوں کے چسکر کاٹنے شروع کئے۔۔۔ خدا خدا کر کے ایک سوچی نے ہامی بھری کہاں بن جائے گی ایڑی لیکن تم بھی گھس گیا ہے۔

”وہ بھی لگا دیکھتے اور کل دسے دیجئے کیونکہ ہم پرسوں جا رہے ہیں“
”لگ جلتے گا۔“

”ہر یہ کیا ہو گا؟“

”بوسے۔۔۔ پچیس شنگ کیا رہ پس؟“ (پاکستان ولے بس اتنے ہی رٹے بھجیں)
ہم نے جوتے تو گھما کر عین اس کی دکان اور نظروں کے سامنے کوڑے کے ڈرم میں پھینک دیا اور تھیلے سے نکال کر دوسرا جوتا پہن لیا جو رتے سے خرید لائے تھے کیونکہ یہ جوتا جو ہم نے پھینکا کراچی سے ہم نے ٹھیک پچیس روپے گیارہ آنے میں لیا تھا۔

”اب چابی کا مسند بھی آخر مل جوا۔ ہم نے کیا۔“ ہمارے سوٹ کیس کا تالا بھی تو ایسا ہی ہے اور اس کی دو چابیاں ہمارے پاس ہیں۔ اسے لگا کر دیکھئے تو۔“

”یہ صاحب نے ڈرتے ڈرتے لگائی اور وہ کھٹ سے لگ گئی۔“

”یہ صاحب کو ہم نے گاڑتے وقت کے علاوہ کو لمبے وقت کا خطاب بھی دیا ہے انھیں ہمارے محلے میں آئے دو ہی دن ہوئے ہیں لیکن اب انگریز تک ان سے استر

پوچھتے ہیں: یثرب میں سن سے ہمارے گھر کا نزدیک ترین راستہ بھی انھی نے دریافت کیا وہ تو عظیم الفرصت ہیں دونوں کے ٹو دیگرہ سر کر کے کلاسٹرا بھی انھی کے سر ہوتا۔ ابھی کل ہی بات ہے کہ بیکر اسٹریٹ سے دائرہ لوجا تے ہوئے ہم تین بار قلعہ گاڑی میں سوار ہوئے اور انھوں نے تین بار ہمیں زبردستی باہر نکالا۔ چند دن اور یورپ میں رہ گئے تو گائیڈ کا پیشہ اختیار کر لیں گے۔

جرمنی

۱۲، اکتوبر تا ۲۶، اکتوبر ۱۹۶۷

اب ہم فرنیکفرٹ میں ہیں

انگریزوں کو دعویٰ تو انگریزی دانی کا ہے لیکن ڈھنگ سے بولنی نہیں آتی۔
 ہمارے پلے بس ان کی آدھی بات پڑتی ہے۔ کبھی وہ بھی نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ
 قسمت ہی تھی جو ہمیں لفٹازا کا جہاز مل گیا۔ ہم لدے پھندے لندن ایئر پورٹ
 کی عمارت پر انتظار کرتے رہے کہ اب ہانک پڑتی ہے۔ اس دوران مائیکروفون پر
 کچھ گلٹناہٹ ضرور ہوئی لیکن ایسی کہ ہم نے اسے قابل اعتماد نہ جانا جب خاصی دیر
 ہو گئی تو ڈسک پر جا کر پوچھا کہ ”بی بی جی — یہ جرمن ایئر لائن لفٹازا کا جہاز نمبر
 ۲۲۳ جاتا کب ہے۔“

”کوئی سا جہاز بی بی نے پوچھا

”فرنیکفرٹ والا“

بولیں: ”وہ تو چل گیا۔ آپ کہاں تھے؟“

ہم نے بتایا کہ ”کافی پی رہے تھے۔“

اب وہ بھاری بھائیوں۔ بولیں۔ قاعدے سے تو چلے جانا چاہیے لیکن شاید

ایک، برآمدے سے دوسرے میں دوسرے سے تیسرے میں۔ مسافروں پر گرتے پڑتے۔ ایکسوز می۔ ایکسوز می کہتے کہتے ایک جگہ پہنچے جہاں مسافروں کو کوچے لے کر ہوائی جہاز تک جاتا ہے کیونکہ آئرلینڈ کا ٹریفک ہے جہاز اس عمارت سے کوئی پین میل دور اترتا ہے۔ اُن لوگوں نے بھی کہا۔ آپ کی قسمت۔ کوشش کرتے ہیں۔ ایک شخص نے ہمیں اپنی جیب میں بٹھایا اور ہری لال روشتیوں کی پروانہ کرتے ہوئے سرٹ بھاگا ہمارے دہان پہنچے تک میٹر بھی اٹھائی گئی تھی لیکن ہم نے کہا۔ ”ارے ظالمو! جرمز کیا کرتے ہو۔ پھر لگاؤ میٹر بھی۔ آخر ہم نے کرایہ دیا ہے۔ مفت تھوڑی جا رہے ہیں۔ اُن کو ہمیں سوار کرتے ہی بنی۔ ورنہ ہمارا سامان جو پہلے ہی بار ہو چکا تھا۔ فرینک فرٹ چلا گیا ہوتا اور ہم خالی لندن میں ٹاپتے رہ جاتے۔

ایک ندی کے دو کنارے ملنے سے مجبور

ہوئل زیرِ سِلن۔ سجان اشد کیا عمدہ ہوئل ہے۔ یہ پہلا ہوئل ہے جس کا غسل خانہ چھوٹا ہونے کی ہم شکایت نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے ساتھ غسل خانہ ہی نہیں۔ ہم نے اتنے ہی منبر صاحب سے کہا۔ یہ کیا غیر معقولیت ہے۔ آپ ہمیں مکروہ دیں یا نہ دیں۔ ہمیں غسل خانہ ضرور چاہیے ہم تنانے دھونے ولے آدمی ہیں۔ بولا جناب یہ بھی نصرت جانئے کہ آپ کا پیغام ڈیڑھ ہفتے پہلے مل گیا تھا اس لیے مکروہ آپ کے لیے ہم نے ریزرو کر دیا ورنہ فرینک فرٹ کتاب میلے کارش ایسا ہے کہ کسی ہوئل میں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ آپ کے فلور پر ایک مشترکہ غسل خانہ ضرور ہے لیکن وہ ایک امر لیج جوڑے نے ریزرو کر رکھا ہے۔ وہ دو دن بعد چلا جائے گا تو شوق سے دن بھر ٹب میں بیٹھ

کر اسٹنان فرمائیے گا۔

”ٹائلٹ تو ہے نا؟ یعنی آپ ہمارا مطلب سمجھتے ہیں۔“

”جی ہاں وہ ہے اور منہ ماتھ دھونے کے لیے آپ کے کمرے میں وہ چیز بھی ہے

آپ سمجھتے ہیں نا؟“

”جی ہاں شکریہ!“

پیرس ریلے غسل خانے کا احوال ہم لکھ چکے۔ لندن میں مسز واٹسن کی سرائے میں جو گلوٹر ہوٹل کے بھاری بھر کم نام سے معروف ہے، ہم دوسرے لوگوں سے ڈیوڑھا کرایہ دیتے تھے۔ کیونکہ اس کے ایک کونے میں ٹاور بھی تھا یعنی اس قسم کا ڈبہ جس کے اندر آدمی کھڑا ہو سکتا ہے لیکن ماتھ پاؤں نہیں بلا سکتا۔ سید سلطٰن حسن نے کہا ”میاں کیا کیا جلئے۔ اوپر کا آدھا دھڑ تو نمایا ہوں۔ ٹائلٹوں پر صابن کیسے لگاؤں۔ اور پانی کا تریڑا بھی بس سر سے چھاتی تک آتا ہے۔

ہم نے کہا۔ یوں دو یا سیکی ہے آپ نے؟“

بولے۔ ”اں کچھ کچھ تو پڑھا ہے۔“

”تو شیر شک آسن کھجئے۔“

”وہ کیا ہوتا ہے۔“ سید صاحب نے پوچھا۔

”سر کے بن کھڑے ہو جائیے اور ٹائلٹیں اوپر کھڑی کر دیجئے۔ پنڈت نہرو سی کیا

کرتے تھے تبھی تو ان کو ہر چیز الٹی نظر آتی تھی۔“

”ان کا غسل خانہ بھی چھوٹا تھا کیا۔“

واقدا علم۔ ویسے چھوٹا نہ ہوتا تو ان کو سر کے بل کھڑا ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ یا پھر اپنے زلمے کے شاعر کو چہ رقیب میں اس شان سے جاتے تھے لیکن نروچی شاعر تو نہ تھے اگرچہ شاعری کیا کرتے تھے۔

ہوٹل زمین میں بس یہ ایک تکلیف تو ہے اور تکلیف بھی کیا ہے۔ بھلا ہوا مری لگیا باٹنی پانی بھرنے چھوٹی۔ نہ نہانے کا معقول عند دل گیا۔ مسلمان یوں بھی جتنے کے جتنے نہاتا ہے اور لگے جتنے میں ابھی کئی روز ہیں۔ باقی ہر لحاظ سے یہ ہوٹل بہت آرام دہ ہے۔ مسز وائس کے ہاں ایک عینہ گزارنے کے بعد تو اور بھی زیادہ آرام و مہلوم ہونے لگا ہے۔ فرش پر تالین ہے۔ تو لیے روز بدے جاتے ہیں۔ مسز وائس سے اس روز سید صاحب نے نیا تو لیا لگا تو بولیں ڈیڑھ پونڈ روز میں تو نیا تو لیا ہلنے سے رہا، ہمارے اس کمرے میں چار روشنیاں ہیں اور ہم چاروں رات بھر جلتے رکھتے ہیں کیونکہ لندن والے کمرے میں ہمیں اپنے پتے سے روشنی کرنی پڑتی تھی یعنی ہر دوسرے تیسرے دن میٹر کو رشوت دیتے تھے۔ اس کی جیب میں ایک شنگ ڈانا پڑتا تھا۔ ابھی اس روز ہم ایک خط لکھنے کو بیٹھے۔ ابھی خیریت موجود خیریت مطلوب تک پہنچے تھے اور غیب سے مضامین خیال میں آنے شروع ہوئے تھے کہ کھٹک سے بجلی بند۔ یہ شنگ والی بجلی انسانی زندگی کی طرح ہے۔ اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ ہم نے سوچا پاس جلا کر اپنا کوٹ تلاش کریں کیونکہ معلوم نہیں کس کرسی الٹس صوفے یا پٹنگ پر پڑا ہے۔ کھونٹی پر ٹانگنے کے ہم قائل نہیں۔ پھر اس میں سے شنگ نکالیں لیکن روشنی ہوتی تو پاس میں ملتی۔ خدا جانے کہاں رکھی ہو۔ پہلے پاس ڈھونڈنا اور اس کو شش میں دھڑا دھڑ

چیزیں گزانا۔ پھر کوٹ ڈھونڈنا اور پھر اس کی کسی جیبیں، ان میں سے شلگ ڈھونڈنا
 پھر میٹر ڈھونڈنا۔ اس کا سوراخ ڈھونڈنا بڑا طویل عمل تھا۔ ہم نے خط اور مضامین غیب
 کے لیے اگلے روز کی تاریخ ڈال دی اور بستر پر دراز ہو گئے۔ رات کو جانے کس وقت
 سید بظ حسن آئے ہوں گے۔ ماچس جلائی ہوگی۔ میٹر کا منہ شلگ سے بند کیا ہوگا۔ اور
 روشنی پائی ہوگی۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔

ہم جرمن زبان پر بھی حاوی ہو گئے

جرمن کے متعلق سنا تھا کہ شکل زبان ہے جس کے لئے 'شکل ہوئی' ہوگی،

ہمیں تو اس کے سیکھنے میں چنداں وقت نہ پیش آئی یہ ممکن ہے اس کی وجہ ہماری طبیعت
ذہانت ہو۔ ہم یہ دعوے نہیں کرتے کہ ہم گوشتے اور شتر کی زبان کی باریکیوں پر تہقید
کر سکتے ہیں یا جرمن زبان کی صرف و نحو پر کتاب لکھ سکتے ہیں، اتنا ضرور ہے کہ فون
میں جا کر بے تکلفی سے کھانا مانگ سکتے ہیں اور راستہ بھی پوچھ سکتے ہیں۔ ہوا یہ کہ

ایک بڑی ناورد روزگار کتاب ہمارے ہاتھ آگئی جس میں کھانوں کے انگریزی نام اور
ان کے جرمن مترادفات لکھے ہیں جس کی وجہ سے ہم کمرے کی کنڈی دنگا کر خشک بسکٹ

ننگے اور پانی پینے سے بچ گئے۔ اس میں لکھا تھا کہ راستہ پوچھنا ہونے لگا ہو WO IST؟

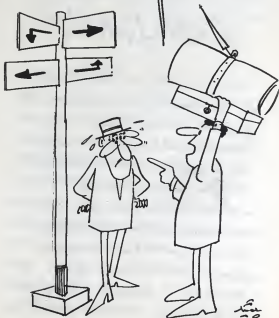
جس کا مطلب ہے "کہاں ہے؟" اس کے بعد مقام مطلوبہ کا نام اور باز راہ اخلاق

BITTE (براہنہ) بھی لکھو وہ جواب میں کہے گا۔ ناخ ریشٹس NACH RECHTS

یعنی دہنی طرف یا ناخ لینکس NACH LINKS یعنی بائیں ہاتھ یا یہ کہ سیدھے

چلے جاؤ۔ گیراؤسے اوس GERADEAUS اس کے بعد تم دیکھتے شرن (شکریر)

NACHLINKS.....?
NACHRECHTS....?



کو اور اپنی راہ لو۔ اب یہ تمام فقرات ہمارے دردِ زبان ہیں، ہم خود پر ہمارا مطلوب مقام دہنے ہاتھ بائیں کو یا سیدھا آگے جوتا ہے، البتہ اگر کہیں ہم اسے پیچھے چھوڑ آتے ہیں اور ایک سے زیادہ موڑ مرنے کی بات ہو یا ہمارا دیا ہوا پتہ شہر کے دوسرے حصے میں یا کسی دوسرے شہر میں ہو تو تھوڑی دقت ہوتی ہے۔ مخاطبِ جرمن میں ایک تقریر کرتا ہے۔ ہم یا... یا (ہاں۔ ہاں) کہنے کے بعد سر ہلا کر دانکے شرن کہتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں کہ کوئی تو ملے گا جو ہماری جرمن زبان کی معلومات کے اندر رہ کر ہمیں بتائے گا، تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی۔

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتر سے
ہزار شاخِ سایہ دار راہ میں ہے

۱۔ انسان مرکب من الخطا والذی ان لبے شک زبان پر ہیں اس حد تک عبور حاصل ہو گیا ہے تاہم احتیاطاً ہم یہ فقرے اور الفاظ ایک پرچی پر لکھ کر مع اردو حروف میں ان کے تلفظ کے اپنی جیب میں رکھتے ہیں اور یہ پرچی جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ کتاب کا لکھنے والا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سخت اُبلے ہوئے اندھے کھانے کا شوقین تھا۔ ہم بان بوائٹڈ کھاتے ہیں یا بان فرائٹڈ۔ اُس نے اس باریکی کا ذکر ہی نہیں کیا۔ لہذا ہمیں بھی سخت اُبلے ہوئے اندھا کھانا پڑتا ہے، یا پھر کل یہ ہوا کہ ہم نے جھننی مرغی کا آرڈر دیا تھوڑی دیر میں پیر یعنی بری ایک بڑا سا قدح اٹھا لائی، معلوم ہوا ہے کہ ہم رداروئی میں جتنا مرغ BRAT HUHNER کی بجائے HUHNER BRUHE (مرغی کا سوپ) لکھ گئے۔ زیادہ

علم وسیع ہونے کا یہی تو نقصان ہے۔ ہم نے صرف ایک ہی لفظ یاد کیا ہوتا تو یہ قیامت کیوں ہوتی، ہم چاہیں تو جرمن زبان میں منشی فاضل کی ڈگری لاسکتے ہیں لیکن کیا فائدہ بلکہ دانستہ احتیاط کر رہے ہیں کیونکہ ابھی ہمیں پوزیشن وغیرہ جانا ہے۔ ان لوگوں کی جرمنی سے لڑائی رہی ہے، کسی نے ہمیں جرمن سمجھایا تو اچھا نہ ہوگا۔ یہ بھی جو کچھ لیکھا ہے اسے ہم جرمنی کی سرحد پر بھلا کر آگے جاتیں گے۔ جیسے اپنی فریج زبان ہم فرانس کی سرحد کے ادھر چھوڑ آئے ہیں یوں بھی آنا سامان کون اٹھائے اٹھائے پھرتے۔

بولن اور کولون میں گر جا اسی طرح ایک پر ایک چڑھے ہوئے ہیں جس طرح بمبول میں مسجدیں۔ اور شان میں بھی یہ استنبول کی مسجدوں پر چٹمک زئی کرتے ہیں۔ کولون کے گر جا کر دیکھئے۔ اس کی رفعت عظمت اور ہیبت آپ عمر بھر نہیں بھلا سکتے۔ فرٹکفرٹ سے آتے ہوئے ہم نے افق پر گر جاؤں کے نیلے کلس بھی دیکھے ایک تو ان میں قلعہ کوہ پر بھی ہے خود ہمارے ہوٹل کے نواح میں پانچ چھ پرانے کلیسا ہیں۔ شام کو ان کی گھنٹیاں بجا رہی تھیں۔ کیا دلا دین سر علی تائیں اثر رہی تھیں۔ دل والوں کو برگ درختاں سبز ہی معرفت کر دیا رکھئے کافی ہیں۔ یہ گھنٹیاں تو پھر صدا رکھتی ہیں۔

ایک تو مٹائی کا فذاب جس کے باعث بعض اوقات گھنٹوں بستر پر پڑے یورپ کا نقشہ دیکھا کرتے ہیں، پھر سیر کرنے والے دوکان اپنی بڑھا گئے۔ ہم نے پوچھا ٹورسٹ آفس سے کہ ہے کوئی جو ہمیں شہر دکھائے، دریائے رائن کی سیر کرانے

اور اپنے ملک کے لئے ہم سے فارغ ایکس پیج ملے۔ لیکن جواب ملا "نائیں" یعنی نہیں۔ ۳۰ ستمبر کے بعد جائزہ فرض کر لیا جاتا ہے اور یہ تمام تفریحی کاروبار ٹھپ سیاح کو چاہئے کہ کمرے میں بیٹھ کے انٹرنیٹ نا پے آخر ہم نے خود ہی رائٹ کی راہ لی، معلوم ہوا کہ وہ تو بالکل ہمارے ہوٹل کے پچھواڑے واقع ہے، یہ سیر جہاڑی بون میں آمد کا حاصل کیئے، کیا خوبصورت سیرگاہ ہے، یا پھر ہم نے برسوں پہلے ہالینڈ اور بلجیم کی سرحد کنوک کے ساحل پر ایسا پایا تھا۔ کشتیاں بھی آ جا رہی تھیں، لیکن ان پر جن منزلوں کے نام لکھے تھے وہ ہمارے نقشے میں نہ نکلیں بلکہ ہے چھوٹی کشتیاں ہوں اور کیا عجیب سو دو سو میل دور ہوں لہذا ہم نے خطرہ مول نہ لیا۔ بیچ پر بیٹھ کر لوگوں کی گفتگو نہ شوخیوں کو دیکھتے رہے۔ یہاں ہتی وغیرہ تو نہیں ہیں لیکن جوڑوں کا عالم یہاں بھی یہی ہے کہ چڑھ جاتی سے لگا چوم یا ہو گئے چپکے

پھر اٹھ کر کینیڈی ہل کے ادھر سے دروازہ شہر میں داخل ہوئے

ادھر رہی کہیں بیتھون کا گھر تھا۔ جی میں آئی کہ اسے بھی دیکھ چلیں۔ بیتھون کا نام ہمارے جن قارئین نے نہ سنا ہو ان کو معلوم ہو کہ یہ جرمنی کا نامور میسرانی تھا۔ گانوں کی دھنیں بنایا کرتا تھا۔ ہم نے بھی ایک آدھ بار جب ریڈیو بند کرنا بھول گئے ہیں اس کی سمفنی سنی ہے۔ کیا بات ہے اس کی۔ لا جواب آدھی تھا۔ ہم سے تو ایسی دھن کہیں نہ بنے۔ ہم اپنی طرف سے تو ٹھیک چلے لیکن راستوں کی بھول جلیوں میں گم ہو گئے۔ ایک جگہ ایک مرد بزرگ، لانا ہی مفید دائرہ سی چہرے پر دانش کی تحریر پیشانی پر بھویں

آنکھوں پر سایہ کتے ایک لگی کے موڑ پر کھڑے مل گئے۔ ہم نے تو جرمین میں پتہ پوچھا۔ جب جرمین آتی ہے تو کیوں نہ بولیں۔ لیکن ان بزرگ نے انگریزی میں کہا بیٹھو ان کا گھر پوچھ رہے ہو صاحبزادے؟ وہ سامنے پچانگ ہے اس کے اندر چلے جاؤ ہم نے کہا۔ "ہماری کتاب میں تو کوئی اور سڑک لکھی ہے۔ یہ تو قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ اس پر دتیانوس نے فرمایا۔ "بیٹا جی! بیٹھو صاحب اب تمہیں اس سڑک پر اس گھر میں نہ لیں گے۔ وہ تو بہت دن ہوتے مر گئے۔ پچانگ کے اندر چلے جاؤ دہنے ہاتھ دیوار کے ساتھ دس نمبر کی قبر ہے۔

اور یوں اس مرد و مانے جہیں یوں کے "قبرستان" آسٹریڈیہ میں پہنچا دیا اور ہم نے بیٹھو ان کی ابدی آرام گاہ دیکھ لی اور وہاں سکوں کا وہ نغمہ سنا جو قبرستان کی چار دیواری کے باہر نہیں جاتا یہ قبرستان اہل کمال کا گنج شایگان ہے جگہ جگہ مٹی کے ڈھیر اور ان پر فخر سفروں، سائنسدانوں، شہرہ آفاق طبیعوں، پروفیسروں کے ناموں کی تختیاں۔ ہر قبر پر سدا بہار پڑے ہیں۔ کہیں کہیں چراغ نمالائین بھی کیونکہ جیٹ پٹا ہورہا تھا۔ قبریں زیادہ تر پچھلی صدی کی۔ کچھ اس صدی کے شروع میں مرنے والوں کی بھی بعض دوسری جنگ سے چند سال پہلے کی بعض قبروں کے سرانے مجھے بھی تھے۔ عام طور پر ایک خاندان کی قبریں سب لیجا۔ اس وقت تک سب لوگ آکر جا چکے تھے ان وہ ختوں کے سامنے اور دم بدم اترتے ہوتے اندھیرے میں یہ دور دیس کا راہی تنہا تھا کبھی گرے کا مرثیہ یاد آتا تھا۔ کبھی کل من علیہا فان کا حکم۔ بڑے بڑے خطیب خاموش تھے۔ میٹافنس محو خواب عدم تھے۔ مشرق و مغرب کی فوج کا خواب دیکھنے والے پاٹوں کی

چوٹیوں پر چڑھنے والے، صحرا صحرا گھومنے والے صاحبان الکشاف و ایجاد تیرہ نوریں
 سیاب پا۔ اب اپنی اپنی دو گز زمین کے اعلیٰ میں مست و مطمئن لیٹے آرام کر رہے تھے۔

پھر روزِ میٹھی نیند میں اے مسکروں و نکیر
 سونے دو بجائی ہیں تو کا ماندہ ہوں راہ کا،



کھانا ہمارا سب

یہاں باڈو ڈسبرگ میں ایک عظیم اشان ادارہ ہے جس کا کام کھچرل ایکٹ چینیج کا انصرام وغیرہ ہے۔ اس کا جرمن نام ہم لکھیں تو ایک تو یہ قباحہ ہے کہ ہجے کی غلطی کر بیٹھیں گے۔ دوسرے وہ ایک آدھ سطر میں نہیں آئے گا۔ اٹھاڑاٹھاڑا حروف کے الفاظ تو جرمن زبان میں عام ہیں لیکن اب یہ بھید کھلا کہ گھبرانے کی بات نہیں مجھ حسن عسکری ولے استاد صبر سہارنپوری کے کلام کی طرح میاں حروف کو ملا کر لکھنے کا رواج ہے۔ کیلے کی ٹیلی جڑ کو یہاں کیلکیلیکیلیجہ لکھیں گے۔ آخر ہم بھی تو آج شب بلکہ ملا کر لکھتے ہیں اور پڑھنے ولے اسے آجین بکو پڑھتے ہیں۔ لکھنے میں جگہ بچتی ہے اور کافذ کی منگانی تو عالمگیر ہے۔

ہم ہر چند کہ جرمن حکومت کے مہمان نہیں لیکن جس بین الاقوامی ادارے کے فرستادہ ہیں اس نے جرمنی کی حد تک ہماری دیکھ ریکھ اسی جرمن ادارے کے سپرد کر رکھی ہے۔ اور واقعی فرمان صاحب نے جو ہمارے پروگرام کے ذمہ دار ہیں۔ حق میزبانی خوب ادا کیا اور مس موزیک شمشیر تو مہربانیوں میں ان سے بھی

بڑھ گئیں۔ بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو خوبے دیکھری۔ تھریں کرام اپنے اسپ
تخیل کو بے لگام نہ ہونے دیں۔ اور بانو ابن پاکستان رشک سے اپنی
انگلیوں کو نہ چبا ڈالیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔

باڈو گوڈ سہرگ ہی میں ہمارا سفارت خانہ ہے۔ ارشد الزماں سے ملنے
وہاں گئے تو میٹر صاحب کو بھی سلام کیا۔ خان عبدالرحمن خاں ہمارے بڑے
کامیاب ڈپلومیٹوں میں سے ہیں لیکن طبیعت اور گفتگو میں بالکل سادہ۔ فرماتے
ہیں: میاں میں تو دیہاتی آدمی ہوں۔ مجھ کو لکھنویت نہیں آتی، اور جرمن لوگ
مجھے اس لئے پسند ہیں کہ سیدھے سادھے پٹھان لوگ ہیں۔ باتوں کے طوطا
مینا نہیں بناتے۔ کوئی بات انھیں خوش آتی ہے تو ٹھیک ورنہ صاف جواب۔
پاکستان کے سچے دوست ہیں۔ مدد دینے میں دوسروں سے آگے خود بخود
کے ملک میں کسی کے دباؤ میں نہیں آتے۔ پھر بہادر ہیں۔ مارے جرمنی میں ایک
بھی نکمرا یا احمدی آدمی نہ ملے گا نہ کسی کو کمزور یا مدقوق پاؤں گے۔

گزشتہ اتوار کو کولون میں ہمارا سبب کھانے کو جی چاہا تھا۔ پورے دو مارک
کے تین آئے تھے۔ آج دوپہر جم مارکیٹ کی طرف جانے کے تو ریڑھی پر سبب
دیکھ کر پھر جی اٹھایا اور انگریزی محاورہ بھی یاد آیا کہ سبب کھاؤ اور ڈاکٹر
کو بھگلاؤ۔ پاکستان میں تو خود ڈاکٹر سبب کھاتے ہیں اور فیس کا بتا کر بھی
بھگاتے ہیں۔ ہم نے دکاندار سے کہا کہ یہ تو ایک مارک جتنے جی چاہے دیدو۔
اس نے ایک بڑا تھیلا اٹھایا اور اس میں پندرہ بیس بھر دیئے۔ ہم نے کہا اے

بھلے مانس فقط ایک مارک کے مے۔ ہم خوردہ فروش دکاندار نہیں ہیں کہ ان سیبوں کی ریڑھی لگائیں۔ فقط ذاتی استعمال کے لیے چاہتے ہیں۔ اس نے کہا جناب یہ ایک ہی مارک کے ہیں۔ وہاں سے جانا تو ہمیں کسی اور طرف کو تھا لیکن اس بوڑھے کی وجہ سے سیدھے ہوٹل آئے۔

سیب کو بالعموم دانتوں سے یونہی کھر کھر کھایا جاتا ہے۔ آخر بھی حیوان ایسے کھاتے ہیں تو انسان میں کوئی سا سرخاب کا پر لگا ہے لیکن اس وقت طبیعت ذرا مائل بہ نفاست تھی۔ ہم نے ہوٹل کی فارغ صابہ سے چاقو چھری وغیرہ کی فرمائش کی تاکہ کاٹ کاٹ کر کھائیں۔ اتفاق سے وہ ڈکٹری جو جرمن زبان میں ہمارے علم و فضل کی دوسرا ہے۔ ہم ادھر کمرے میں چھوڑ آئے اور چھری کی جرمن ہمیں زبانی نہیں آتی۔ داروغہ صابہ کو انگریزی میں دخل ضرور ہے لیکن بس ایسا ہی، جیسا ہمیں جرمن میں ہے۔ ہم نے کہا ”مافک چاہیے، اپل کاٹنا ہے“ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ تو ہم نے ایک ہاتھ میں خیالی سیب رکھ کر دوسرے میں خیالی چھری لی اور اسے کاٹا۔ بچاری کندہاں پھر بھی نہ سمجھی۔ اب ہم نے بریک فاسٹ کا حوالہ دیا اور اشاروں اشاروں میں توس پر چھری سے مکھن لگایا۔ یہ اشارہ بھی مکھن لگانے سے زیادہ نائی کے اسٹرائیز کرنے سے زیادہ قریب ہو گیا۔ لہذا ہم نے خیالی سیب کو پھر دو ٹکڑے کیا۔

یہ ایک محترم نے چمک کر کہا ”سیب“؛

ہم نے بھی خوش ہو کر کہا ”ہاں“ سیب۔ اتنی دیر سے یہی تو کہہ رہا ہوں

کہ سیب لٹا ہے۔ اب لاؤ پھری۔“

ایک روز ہم نے پائیں ایل مانگا تھا تو دوکاندار نے کہا ”اناس بہت
 ہمیں معلوم ہوا کہ بیاں یہ پھسل اناس ہی کہتا ہے۔ اب بیاں بھی ہم اتنی
 دیر سے ”ایل“ کاٹنے کی بات کر رہے تھے۔ شروع ہی میں سیب کہہ دیتے تو
 یہ فوراً سمجھ جاتیں۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ کسی نے اردو اور جرمن زبان کے مشترک
 الفاظ پر اب تک کچھ نہیں لکھا۔ کسی کو توفیق ہی نہیں ہوئی۔ شاید اس لئے کہ کسی
 کو جرمن آتی ہی نہیں تھی۔ ہم نے طے کیا کہ عدیم الفرستی کے باوجود وطن واپس
 جا کر ہم اس موضوع پر محققانہ مقالہ لکھیں گے۔ ایک تو یہ سیب ہی مشترک نکلا
 اور بھی بہت سے الفاظ ضرور مشترک ہوں گے۔

اتنے میں محترمہ برآمد ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں نہانے کے صابن کی ایک
 ٹکیہ تھی۔ بولیں ”یہ بوسیوب۔“

آنا برلن اور ٹھہرنا کفرستان میں

برلن۔ برلن۔ برلن ! اے صاحبو خطا خطی بند باندھ لو، برلن آیا جاتا ہے
 کسی اور شہر کے سوا دیں جی پردہ ہیبت طاری نہیں ہوتی جو برلن پہنچے پر ہوتی
 ہے بشرطیکہ آنے والا کھانوں کا تاجر اور محض ایکسپورٹر امپورٹر نہ ہو۔ یہ شہر ہے
 پرشیا کی سلطوت و جبروت والے بادشاہوں کا۔ شاہ فیئرڈرک اعظم کا۔ پرنس
 ہسارک کا۔ قیصر ولیم کا۔ ہٹلر کا۔ آگ اور دھوئیں کا۔ ملکوں کی قسمتوں، کرداروں
 انسانوں کی تقدیروں کے اعلان یہاں سے ہوتے تھے۔ نوشتے یہاں سے جاری
 ہوتے تھے۔ یہ مٹرکھیں جن پر اب شگفتہ چہروں والے لوگ چل رہے ہیں اور
 میاں آزاد ہم بے غل و غش قدم مار رہے ہیں۔ یہاں گسٹاپو کا عمل تھا۔ نازیوں
 کے جیش پر نہیں کرتے گزرتے تھے۔ سوسٹیکا کا جھنڈا اٹھاتا تھا۔ مائیکروفونوں
 سے فیوہرر کی ٹھن گسج سنائی دیتی تھی۔ زنداں آزادی پسندوں سے بھرے
 تھے۔ نواحیات بندی خانوں سے آباد تھے جہاں لاکھوں بے بس انسانوں کو گیس
 کی بھٹیوں میں جھونک دیا جاتا تھا۔ ان کی چربی سے صابن بنتا تھا۔ ان کی ٹہریں

سے کھا دیتی تھی۔ اتحادیوں نے اگر ان بندی خافوں کو دیکھا تو فقط زندوں اور مردوں کے ڈھانچے پائے یا گو دھام دھام انبار دہا بنا رہیں اور بڑوں کے جوتوں کے جوڑے ان کے جوتامیک راہوں میں مارے گئے۔ اور آج یہ بلدہ پھر شر ہے خوشحال خوش باش اور خوش نما دلوگوں کا۔ انسان غلیم ہے خدایا !

ہمارے میزبانوں کی فرستادہ ایک لڑکی ایئر پورٹ پر ہمارا انتظار کر رہی تھی خوش آمدید ہم نے کہا : اے بی بی کیا نام ہے تیرا ؟
بولیں : سُو

”بہت چھوٹا نام ہے سُو۔ ہم نے کہا : اے نیک بخت ! ہم دینائے سُو اور مردان سُو اور علمائے سُو د جانے کس کس سے بچتے یہاں تک پہنچے ہیں تو ہمیں اپنا اصلی نام بتا۔ تب بولی ”بندی کو فرانس کا کہتے ہیں۔ ہم نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ فرمایا بھ آپ کے ساتھ رہنا ہوگا۔ وضاحت بھی کو دی صبح سے شام تک ہم نے کہا اچھا تو ہمیں اپنا شہر بھی دکھاؤ گی۔ تب اس نے جیب سے ایک لانا کاغذ نکالا جو چھپا ہوا تھا۔ ”پروگرام برائے حضرت ابن اشا آن اسلامک سوسائٹی پاکستانی ہم نے کہا ہم سے دفتر نہیں دیکھا جاتا۔ ہم اتنے لوگوں سے نہیں مل سکتے۔ اتنی لائبریریوں کو ملاحظہ نہیں فرما سکتے۔ سخن کو مختصر کرو ہم سے بون ہی میں نیومان صاحب نے کہہ دیا تھا کہ برلن جا کر کام کے جھیلوں میں نہ ڈرنا۔ کچھ شرمی دیکھنا۔ بولیں اب تو پروگرام بن چکا۔ ان لوگوں کو اطلاعاتیں ہر چکیں۔ اب ان کو منسوخ کرنا ممکن نہیں۔ ہم نے کہا ہم بریڈن برل گیٹ پر کب جاتیں گے۔



برلن — ایک تباہ شدہ اور جا کے پس منظر میں

دیوار کب دیکھیں گے۔ مودی محبوب عالم کا ہوئی کب تلاش کریں گے۔ پھر مشرقی
برلن بھی ہمیں ضرور جانا ہے۔ ہم نے بون میں تمہارے دفتر سے کہہ دیا تھا لیکن

وہ بچاری کیا کر سکتی تھی۔ بولی: "ٹامیں آپ کی خالی ہیں۔ بیچ میں بھی کیس کیس ایک دیکھنے آپ کو مل جائیں گے۔ ان میں آپ چاہیں تو شاپنگ کر لیں۔ ہم نے کہا بی بی، شاپنگ کی بات ہم سے نہ کر کہ ہم تو خود اپنے کو بیچنے نکلتے ہیں۔ کوئی دل و جان کا اچھا خریدار ملے تو ہمیں بتانا۔"

برلن کہنے کو چار حصے ہیں لیکن واقعہ الگ فقط مشرقی حصہ ہے سوڈٹ سیکٹر۔ دیوار کے پچھلے۔ باقی تینوں یعنی امریکی، برطانوی اور فرانسیسی سیکٹر باہم ملے ہوئے ہیں، انتظام سب کا اکٹھا ہے۔ کوئی چوکی پرہ نہیں۔ آپ معلوم نہیں کر سکتے کہ ان تینوں میں سے آپ کس سیکٹر میں ہیں۔ سوڈٹ سیکٹر یعنی مشرقی برلن۔ وہ البتہ !

مغربی برلن کی مرکزی شاہراہ کا نام ہے KURFURSTEN اسے اپنے حساب سے پڑھا تو آواز نکلی۔ "کفرستان" اسی پر ہمارے ہوٹل کا نام تھا۔ "ہوٹل کفرستان" یعنی کفر کا دم چھلہ بیاں بھی ہمارے ساتھ رہا۔ ع یاروں کو تجھ سے حالی کیا بدگمانیاں ہیں

ہم نے پہلے تو احتجاج کرنا چاہا کہ اسلامک ری پبلک کے آدمی کیسے آپ نے اس نام کا ہوٹل کیوں مقرر کیا۔ پھر اس خیال سے چپ ہو گئے کہ اس ہوٹل میں اور اس شاہراہ پر تہان کا فر سے ڈبھڑ ہوا کرے گی۔ کیا جب کوئی موقع تبلیغ کا نکل آئے۔ اور کوئی ان میں سے راہ راست پر آکر ہمارے دست

حق پرست پر بیعت بھی کرے لیکن اسے بسا آرزو کہ خاک شدہ کسی کافر کو تو ہم اپنی راہ پر نہ لاسکے۔ ان ہمارا ایمان ضرور کئی بار متزلزل ہوا۔

ہوٹل ہمارا اچھا تھا۔ اتنے دنوں بعد ڈھنگ کا ہوٹل رہنے کو ملا۔ یورپ میں نجی ہاتھ روم والا ہوٹل ایک نعمت ہے جو پہلی بار نصیب ہوئی۔ ورنہ کسی نہ کسی حاجت (ضروریہ وغیرہ ضروریہ) کے لئے باہر جانا پڑتا ہے۔ چوغہ یا جبرجھا لا یعنی ڈرینگ گون ہم نے خاص اسی مطلب سے خریدا۔ فریکفرٹ والا ہوٹل زلیلی بھی اچھا تھا لیکن اس کے مقابلے میں نمبر دو۔ بون کا ہوٹل نمبر نسبتاً مستاعظم ہوتا تھا۔ لیکن مینجر صاحب نے بل بنایا تو اس میں تین مارک کسی چیز کے الگ لگے تھے۔ ہم نے کہا یہ کیا۔ بولیں آپ ایک روز نمائے جو تھے غسل خانہ مشترک سہی لیکن آپ نے استعمال جو کیا ہے تو اس کے پیسے بھی دیجئے۔ ہم نے شکر کیا کہ چار دن میں فقط ایک بار نمائے۔ ورنہ ہم اپنے حلقے میں پانی کا جانور کہے جاتے ہیں۔ روز نماتے ہیں۔ ہوٹل نمبر میں بھی ہم سے یہ حرکت ضرور ہوتی۔ لیکن جس غسل خانہ ملا ہی نہیں تھا۔ پوچھنا پڑا کہ آخر یہ چیز ہے کہاں؟ معلوم ہوا اوپر چھت پر ہے۔ بیت الفلا میں البتہ آپ بغیر پیسے دیئے مار پر جا سکتے ہیں۔ بل میں تین مارک ادا لگے تھے۔ ہم نے کہا اس کی وضاحت بھی ہو جائے۔ فرمایا

آپ کے کمرے میں کمرہ گرم کرنے کی سلاخیں لگی ہیں نا؟ یہ تین مارک HEATING کے۔ ہم نے کہا وہ تو ہم نے استعمال ہی نہیں کیں بلکہ رات کو کھڑکی کھول دیتے تھے تاکہ تازہ ہوا آتی رہے۔ کمرے میں تو جس تھا۔ بولیں: استعمال کرنے نہ کرنے کی



برسن کا ایک چوک

سند نہیں ہے۔ پیسے تو دینے ہوں گے۔ ہم نے حساب جوڑا تو وہی پایا جو اچھے ہوٹلی کا ہوتا ہے۔

صرف کفرستان ہی نہیں۔ اور بھی کئی لفظ ہم نے اپنے حساب سے یاد کئے
 ناشتے کے لئے جس میں بڑا ٹیڑھا لفظ ہے FRUSTUCK، ناشتے کے کمرے
 پر لکھا نظر آیا۔ FRUSTUCKRAM ہم نے کہا وہ مارا یہ فرس تکا رام کی غزنی
 ہے۔ سنت تکا رام کا نام کس نے نہیں سنا۔ اگرچہ یہ کون تھے اور کیا کرتے

تھے تارین کرام کی طرح ہمیں بھی معلوم نہیں۔ فرس کا مطلب گھوڑا یعنی سنت
 تکارام کا گھوڑا۔ ظاہر ہے سنت صاحب کے زمانے میں گھوڑے ہی کی سواری
 ہوتی ہوگی۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ جرمنوں نے ناشتے کے کمرے کے لئے یہ بے شکا
 نام کیوں رکھا۔ گھوڑے کو ناشتے کے کمرے سے کیا نسبت تا آنکہ یہ رعایت
 ملحوظ نہ ہو کہ دلی والے بھی نہاری کھاتے ہیں اور پنجاب میں تانگے کے گھوڑوں
 کو جو بھوسہ چنے وغیرہ دیئے جاتے ہیں وہ بھی نہاری کھاتے ہیں۔ ہماری تحقیق
 کا ٹوٹا اس میدان میں نہیں تک جاتا ہے آگے اپنے قیل معنی کو متحقق نکالیں۔

ہوائی سفر کے آرام پر سب کی نظر ہے لیکن اس کی باتوں اور صعوبتوں کو
 دہی جانتا ہے جو اس سے بار بار گزرے اور مجھے اپنے اسباب کا وزن حد میں
 رکھنے کے لئے اسے بار بار کاٹنے سے تو لپا پڑے اور چیزوں کو پھینکنا پڑے۔
 ہم تمام مسافروں کے مقابلہ میں دس گون زیادہ سہ جانے کا حق رکھتے ہیں گلی تیس گلو
 یعنی چھپا سٹھ پونڈ۔ لیکن لندن سے چلے تو سترہ گون زیادہ تھے۔ جس کے پیسے الگ
 دینے پڑے یہ نہ سمجھا جلتے کہ اس میں کوئی چیز غیر ضروری ہوتی ہے۔ ہم محتاط آدمی
 ہیں۔ کچھ وزن تو ہمارے ساتھ چودہ اور اٹھنے کی گولیوں کا ہے، اتنا بے سفر ہے
 اس لئے ہم نے خاصا ذخیرہ ساتھ رکھا ہے۔ ہیرائل کی بھی چند مشیناں ہیں جانے
 کب ختم ہو جائے پر دیں میں کہاں ڈھونڈتے پھریں گے کہ ہمیں روغن آئل خاص
 انخاص یا باون جڑی بوٹیوں والا تیل چاہیے۔ کچھ پرانے رسالے نقوش اور فنون کے
 سامانے اور بعضے ضخیم ناول اور تنقید کی کتابیں بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ تنہا آدمی

کا جی گھبراتا ہے۔ مطالعے کے لئے ساتھ کچھ نہ کچھ رہنا ہی چاہیے۔ ایک سیٹ ہمارے ساتھ ہمارے دوست عبدالعزیز خالد کی کتابوں کا بھی ہے جن کی مدد سے ہم عربی سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں قاہرہ وغیرہ جانا ہے اور جامع ازہر کے شیخ سے گفتگو کرنی ہے۔ کچھ پرانے رسالے ہم نے لندن سے خریدے۔ پھر ہر شہر کے نقشے، گائیڈ بکس وغیرہ بھی ہیں۔ ہمارا جی تو انسائیکلو پیڈیا بریٹیکا بھی ساتھ رکھنے کا تھا کیونکہ پریس میں معلومات کی بڑی ضرورت رہتی ہے لیکن اسی سامان کے بوجھ کی تدخین کی وجہ سے نہ لاسکے۔ ہماری بوجھ اٹھانے کی صلاحیت بھی محدود ہے۔ کیونکہ منڈی میں اناج کی بوریاں ڈھونڈنے کا کام ہم نے نہیں کیا۔ یورپ میں قہقہے مٹتے اور سوٹ کپس گٹھریاں، پوٹیاں، بریف کیس، تھیلے اتنا کچھ ہمارے ساتھ ہے کہ ہم گنتی تک بھول جاتے ہیں۔ یورپ دے کوئی چیز دیتے ہیں تو اس کا تھیلہ اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ اسے پھینکنے کو ہی نہیں چاہتا۔ پورٹر لیبن مل گیا تو اس کا منہ موتیوں سے بھرنا پڑتا ہے۔ جہیں بس نے فریگٹرٹ کے ہوائی اڈے کے غلط دروازے پر اتار دیا تھا۔ پورٹر نے صبح دروازے تک پہنچایا۔ ہم نے چار روپے دے کر یہ جانا کہ خوش گیا لیکن اس بندہ خدا نے تھکرار کی کہ چھ روپے دو، اور بے کر ٹلا۔ اس پر اپنے قہقہے یاد آئے۔ تین ٹرنک سر پر ہیں، آپ کے بستر کیس کو جس میں دو رضائیاں، کپس، بوتلے اور کراتے سے بچنے کے لئے نہ جانے کیا کیا آپ نے باندھ رکھا ہے، اپنے کاندھے میں محافل کرتا ہے اور پھلوں کی ٹوکری ایک ہاتھ میں، تھیلہ اور صراحی دوسرے میں، ناشتہ دان کسٹی سے لٹکا ہوا۔ بوجھ سے لہرا ہوا چلتا ہے۔ پل پار کرتا ہے آنکھیں باہر نکلی پڑتی ہیں اس کے بعد التجا



کرتا ہے کہ اسے چار پیسے زیادہ مل جائیں۔ بعضے نیک دل دونی چوٹی قسے دیتے ہیں۔ بعضے ڈانٹتے ہیں قانون کا حوالہ دیتے ہیں۔ ایک زلٹے میں ایک آنر فی نگ فی پھیرا کر رہ تھا۔ الٹی کی شکل بھی بنی رہتی تھی کہ کوئی زیادہ مانگے تو اسٹیشن ماسٹر کے پاس رپورٹ کی جلتے۔ اب شاید دونی یا چوٹی کا ریٹ ہے۔ گاڑی چل دیتی ہے تو ہمارا یہ بھائی پاکستان کی روز افزوں ترقی اور اقبال مندی کا حصہ دار لال ٹکڑی سر کے نیچے رکھ پیٹ فارم پر آرام کرنے کو لیٹ جاتا ہے اپنے روشن مستقبل کی ٹرین کے انتظار میں جس کا سگنل نہیں گرتا، جو آئیں باقی۔

جب سے ہوائی سفر کا رواج ہوا ہے، لوگوں میں باہم محبتیں بھی کم ہو گئی ہیں۔ خلوص بھی رخصت ہوتا جا رہا ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر مٹی باز دھے اکڑا بیٹھا ہے۔ یہ نہیں کہ پاس والے سے کلام کرے۔ اس کی خیریت پوچھے۔ ذات پات وطن دریافت کرے۔ مسائل حاضرہ پر چندے گفتگو ہو۔ کچھ آل اولاد کے کو الٹ دریافت ہوں۔ کتنے بچے ہیں، کیا کرتے ہیں۔ کتنوں کی شادی ہو چکی۔ جہیز میں کیا آیا۔ گھمیر کب آزاد ہو گا۔ عرب کیسے جیت سکتے ہیں۔ سچا مسلمان بننے کی کیوں ضرورت ہے۔ نئی نسل میں بے راہ روی اور بے شرمی کیوں پھیل رہی ہے وغیرہ اس کے علاوہ ہوائی سفر میں آزادی بھی محدود ہے۔ آپ بس اپنی سیٹ پر بیٹھ سکتے ہیں۔ چادر بچھا کر پودی برتھ پر پاؤں نہیں پسا سکتے، جیسے ہم تھڑا اور انڈر میں کرتے ہیں۔ نہ ٹرک اور بچیاں پھیلا کر دوسرے مسافروں کا راستہ روک سکتے ہیں۔ پھر ریل میں آپ کے پاس آموں کی ٹوکری ہے، مزے سے آم کھائیے اور

اس کی گتھیاں فرش پر پھینکے۔ کسی کی کیا مجال جر ٹوک سکے۔ اگر لبا سفر ہے اور
 برا پنج لائن ہے۔ آپ کو ٹوبہ ٹیک سنگھ جانا ہے تو حقہ بھی ساتھ رہنا چاہیے اور
 تبا کو اور اُپوں کا تھیلہ بھی۔ اپنے نہیں تو گاڑی کے فرش پر کاندھوں سے آگ
 جلائیجئے۔ دھوئیں لگا کیا ہے کسی صورت باہر نکل جانے گا۔ جہاز کے سفر میں تو
 چڑھتے اترتے وقت ”نوا سموکنگ“ کا حکم رہتا ہے۔ اور اس بے آرامی کے
 کھڑاگ کا نام کیا رکھا ہے — ’ہوائی جہاز‘

ہمت تیری ہوائی جہاز بنانے والے کی۔



مفتی محبوب عالم ایڈیٹر مسیحا اخبار

برلن — ہمارا اور منشی جی کا

ہم بن گائیڈز بکوں کی مدد سے بلا دیورپ کا سفر کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو ۱۹۶۶ء کی چھپی ہوئی ہے جس کا نام ہے: "یورپ میں پانچ ڈالر روزہ میں گزارا کیسے کیا جائے"۔ اس میں جگہ جگہ کے ہوٹلوں، سرائوں، ڈھابوں اور سستے ٹھکانوں کے پتے دیئے گئے ہیں۔ یہ سال بھر پرانی ہے۔ اس لئے بہت سی باتیں غلط ہو گئی ہیں بلکہ ہمارے تو یہ کسی کام نہ آئی۔ استنبول میں ہمارے دوستوں نے ڈیڑھ ڈالر روزہ کا ہوٹل تلاش کر کے مصنف کتاب کو زکریٰ اور ولایت میں کہیں ہمارا گزارا آٹھ دس ڈالر سے کم میں نہیں ہوا۔ دوسری گائیڈ بک کی بتائی ہوئی ہدایتیں بھی بہت دور انداز رہیں۔ اول تو اس کا مصنف پلٹن ہوٹل سے کم میں کہیں ٹھہرا نہیں۔ دوسرے اس کے سال طباعت ۱۹۵۵ء سے لے کر اب تک دنیا بدل گئی ہے۔ تیسری کتاب کے بتائے ہوئے اُتے پتے البتہ بہت جگہ صحیح نکلے۔ یہ اصل میں ایک سفر نامہ ہے۔ آج سے سترھ سال پہلے ۱۹۰۰ء کے سفر کا تصنیفِ لطیف منشی محبوب عالم ایڈیٹر ملیہ

اخبار۔ ذہن اس ضخیم کتاب کا کوئی دو پونڈ کے قریب ہوگا۔ ہوائی سفر میں ہر بار جو ہمیں زائد اسباب کا جہاز نہ دینا پڑتا ہے وہ بڑی حد تک اسی کتاب کے باعث ہے۔ برلن میں اس کتاب نے ہمیں بہت دوڑایا۔ ہم نے پوچھا فریڈریش سٹراس کہاں ہے تاکہ قیصر ہوٹل دیکھا جاتے جہاں مولوی صاحب ٹھہرے تھے۔ بتانے والوں نے بتایا کہ یہ سڑک تو مشرقی برلن میں ہے اور بہت طویل ہے۔ پہلے اس ہوٹل کا مکان نمبر تو معلوم ہو۔ پھر چاہے ہوٹل رہا ہے یا نہیں رہا ہے۔ کم از کم وہ پرانی عمارت یا جاتے وقوع تو دیکھ لو گے۔ لہذا پہلی جستجو پرانی ڈائرکٹریوں کی ہوئی یہ مغربی برلن کی اسٹیٹ لائبریری میں مل گئیں جہاں یہ لوگ ہمیں لاطینی زبان کے مخطوطے دکھانے لگے تھے۔ ۱۹۱۷ء کی ڈائرکٹری ہاتھ آئی۔ اس میں قیصر جوف نامی ہوٹل کا پتہ درج تھا۔ کسی اور سڑک کا۔ ہم نے کہا۔ یہ نہ چاہیے۔ سب سے پرانی ڈائرکٹری اس ذخیرے میں ۱۸۷۰ء کی تھی۔ اس میں بھی دُرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ آخر ہم نے کہا۔ بس اس سال کی دیکھنی چاہیے۔ ۱۹۰۰ء کی۔ خوش قسمتی سے مل گئی اور اس میں پتہ بھی صحیح تھا۔ مکان نمبر بھی دیا تھا ۷۸ء مالک کا نام اور ٹیلی فون نمبر بھی درج تھا۔ نمبر ۶۲ -

دوسری چیز جس کی ہمیں تلاش تھی وہ برلن کے ایک پرانے اخبار بریئر ٹاگ بلاٹ یعنی "روزنامہ برلن" کا ایک پرانا پرچہ تھا۔ منشی جی نے برلن پہنچتے ہی پانچ چار اخباروں کے ایڈیٹروں کو ملاقات کے لئے خط لکھ دیئے تھے۔ قریب قریب سب کے جواب دوسرے روز مل گئے۔ بلکہ۔ "بریئر ٹاگ بلاٹ جو سیاں کا آئل درجے کا آزاد اور انٹرنیشنل اخبار سمجھا جاتا ہے اس کے ایڈیٹر

ڈاکٹر لیوی سن نے میرے خط کا جواب بذریعہ "اورہ پوسٹ" یعنی دم کشی کی ڈاک سے اسی سہ پہر کو بھیج دیا تھا۔ یہ طریقہ خط بھیجنے کا بھی برلن میں عجیب ہے۔ جس خط کو شہر کے دوسرے حصے میں بھیجنا مطلوب ہو اس پر معمولی ڈاک سے دو چند محصول کا ٹکٹ چسپاں کیا جاتا ہے۔ یہ خط ایک نفلوں کے سلسلے کے اندر سے بذریعہ ہوا کے زور کے پہنچاتے جاتے ہیں یعنی ٹکے میں خط ڈال کر چھپے مشین کی ہوا سے دھکا دیا اور دم زدن میں منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ جہاں سے تار کی طرح جلدی ہی تقسیم کر دیتے گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ لندن میں بھی یہ طریق ڈاک کا جاری ہو گیا ہے۔ اور پیرس میں بھی۔

غرض چٹھی پاتے ہی میں ۷ جولائی کو ۸ بجے شام کے مقررہ وقت پر برلینز ٹاگ بلاٹ کے دفتر میں پہنچا۔ ڈاکٹر لیوی سن اپنے کمرے سے باہر نکل کر مجھے اندر لانے ساتھ لے گیا۔ ہندو مسلمانوں کی آبادی اور گورنمنٹ سے رعایا کے تعلقات پر گفتگو ہوئی۔ اور جب میں نے بھی یا کہ کانگریس والے وہی خدمات سرانجام دینا چاہتے ہیں جو کسی زمانے میں فریق مقابل گورنمنٹ (اپوزیشن) ادا کرتا ہے تو اس کا ظن رفع ہوا کہ رعایا سرکار سے ناراض نہیں۔

میرے پاس پیسہ اخبار کا نمونہ موجود تھا۔ جرمن ایڈیٹر اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس کی قیمت کی ارزانی اور مقدار اشاعت دونوں باتوں کو پسند کیا بلکہ مجھ سے وہ پرچہ لے لیا اور اپنے دوسرے روز کے اخبار میں میسری ملاقات کی کیفیت مع پیسہ اخبار کے ایک کالم کے نوٹو گراف کے چھاپ دی۔

ہم محقق نہیں ہیں لیکن محققوں کے تمیز و تشدید تو رہے ہیں اور لوگ کسی کا کچھ
 یونیورسٹی میں آج کل نہیں پڑھاں کے نکالے ہوئے تو ہیں۔ رجحان ہمارا اہل علم
 ہی کا ہے کہ وہی دکنی کے بیٹے کے ختنوں کی صحیح تاریخ معلوم ہونی چاہیے خواہ
 اس کے لئے کسی کو پی ایچ ڈی کیوں نہ بنانا پڑے۔ پس ہم اس مسئلے سے بچ گئے
 کہ یہ پرچہ تلاش کرنا چاہیے۔ اور اس کا نوٹ لے کر چھپوانا چاہیے تاکہ صاحبان
 تحقیق میں ہمارا نام لکھا جاتے۔ سب سے پہلے تو ہم فرنیگٹ یونیورسٹی میں
 گئے اور اس اخبار کا اٹاپہ دریافت کیا۔ معلوم ہوا اس کا کوئی خاص فرنیگٹ
 ممبر میں نہیں ہے۔ پھر کوئٹہ اور پون میں جاتے ہی لائبریریوں کے پھرے کیے۔ یہ
 کتاب یہاں بھی نہ ملی۔ مغربی برلن پہنچتے ہی ہم نے میزبانوں سے کہا کہ باقی میں نہیں چاہیے
 گھوڑا نہیں چاہیے۔ بس برلین ٹاگ بلاٹ کو یہ پرچہ چاہیے اس کے لئے ہم نے
 منادی کرائی۔ گشتوں کو مختلف علاقوں کے کتب خانوں میں دوڑایا لیکن خالی
 ہاتھ واپس آئے۔ ایک لائبریری یہاں کی مایہ ناز لگنی جاتی ہے۔ ایک اونچی عمارت
 ہے، لاکھوں کتابیں ہیں۔ ہمیں اس کے کتا دھر تا بڑے اور کے ساتھ لے گئے
 تھے کہ ہم دیکھ کے تعریف کریں گے۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے لیکن اگر جوابی ۱۹۰۰
 کا برلین ٹاگ بلاٹ تمہارے پاس نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے اپنا سامنہ سے کر
 رہ گئے۔

تب ہم نے کہا اب ہم مشرقی برلن جاتے ہیں۔

یہ عالم ہمارے مغربی جرمنی کے میزبان ہیں لوگوں سے ملانے اور لائبریریاں



برلن میں کارگردوں کے مجسمے

دلکھنے میں اتنا معروف رکھتے تھے کہ مشرقی برلن جانے کا وقت ہی نہ ملتا تھا۔
 انگریز لائبریریوں سے ہم یہ کہہ کر بھاگے کہ ہماری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور
 یہاں سے شاڈ بان کے اسٹیشن پر پہنچے۔ شاڈ بان اے سادہ لوح قاریوں کو مسمی
 بلکہ یا چڑیا کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص ریل کی سواری ہے۔ اس کے ڈبوں میں
 بھی کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے تو پھر یہ کیا ہے؟ جہیں برلن جانے سے پہلے ہی
 منشی محبوب عالم کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔

”شہر کے اندر دنی حسہ کے گرد اور عام طور پر شہر کے اندر ایک حلقہ ریل
 کا گزرتا ہے جس کی سڑک ایک منزلہ مکانات کی چھتوں کے برابر یا بیس فٹ بلند ہے
 اور اس سڑک کے نیچے ۲۰ فٹ بلندی پر شہر کے اندر ہیں جہر من اس کو شاڈ بان یعنی شہر کی

ریل کہتے ہیں۔ اس کے اسٹیشن دو دو میل کے فاصلے پر ہیں۔ گاڑی ہر پانچ منٹ کے بعد ہر اسٹیشن سے دونوں طرف روانہ ہوتی ہے اور نصف منٹ سے زیادہ کسی اسٹیشن پر نہیں ٹھہرتی اس ریل کو پرس بسمارک نے تجویز کیا تھا۔ ٹکٹ دینے کے لیے کوئی شخص نوکر نہیں البتہ چند مشینیں یسٹر بکسوں کی طرح کھڑی ہیں جب کوئی ان میں فیتی کا سکہ ڈالتا ہے۔ جھٹ ایک ٹکٹ تیسرے درجے کا ان کے ایک منہ سے گر پڑتا ہے۔

سترھ سال ہیں اگر اس معمول میں کوئی فرق ہوا تو یہ کہ اب ریل پانچ کی بجائے ہر پندرہ منٹ بعد چھوٹنے لگی ہے اور ٹکٹ دینے کا سلسلہ آٹومٹک نہیں رہا بلکہ آدمی کھڑکی میں بیٹھا پیسے لیتا ہے ٹکٹ دیتا ہے۔ آٹومٹک سلسلہ ہم نے فقط مشرقی برلن کی بسوں میں دیکھا۔ اس فرق سے قطع نظر یہ وہی راستے وہی ہیں۔ اسٹیشن وہی ہیں۔ اور شاید کچھ گاڑیاں بھی وہی ہیں جن میں ہمارے منشی صاحب بیٹھے رہے ہیں۔ ہم بھی بیٹھ کر اترے تو مشرقی برلن میں اسی اسٹیشن پر اترے۔ جہاں سے منشی صاحب چڑھتے اترتے ہوں گے۔ فریڈریش سٹراس کا اسٹیشن۔ سٹراس کا مطلب روڈ ہے۔ ہر سڑک کا نام اس پر تمام ہوتا ہے۔

مشرق برلن کا کسٹم والا ہمارے تھیلے کے کاغذوں کتابوں کی پڑتال میں کچھ زیادہ ہی دیر لگا رہا تھا بلکہ ہمارا ایک آرٹیکل ایک جرمین رسالے میں چھپا ہے وہ بھی شومئی قسمت سے بے تے میں تھا۔ اس کا بالاستیغاب مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ ہم نے کہا اے بھیا۔ چھوڑ اسے۔ اپنے پاس رکھ لے اور ہمیں اسٹیٹ لائبریری کا پتہ بتا۔ اس پر وہ بھلا مانس چونکا اور کہا۔ جاؤ فریڈریش سٹراس سے انٹرون لینڈن

بائیں ہاتھ مڑو۔ تصویری دور بعد بائیں ہاتھ کو اسٹیٹ لائبریری کے اسٹاٹ
بلیوٹھک آٹھ بجے تک کھل رہے گی۔

ہم نے مشرقی برلن کے سیاسی اور اقتصادی حالات اور دوکانوں کا مطالعہ
آئندہ پر چھوڑا اور لائبریری کا رخ کیا۔ بڑی پرسکون عمارت ہے۔ چوڑے پاٹ
کی سنگین اور بلند دہلا، جنگ میں ایک حصہ تباہ ہو گیا تھا لیکن زیادہ ترمیم رہی
کتنی ہی میسرھیاں چڑھنے اور غلام گروٹوں سے گزرنے کے بعد رسالوں اور اخباروں
کا شعبہ آیا۔ بہت سے لوگ سر جھکاتے پڑھ رہے تھے۔ قابل مختلف میزوں پر
پڑے تھے۔ ایک بی بی لائبریرین سر جھکاتے اپنا کام کر رہی تھیں۔ ہم نے عرض
مطلب کیا کہ ہم برلینر ٹاگ بلاٹ کی تلاش میں آہنی پردے کے پیچھے آئے ہیں۔
ہمارا سوال پورا ہونا چاہیے۔

یہ محترم بہت کم انگریزی جانتی تھیں۔ الٹک الٹک کر بولتی تھیں۔ فرمایا: بل
تو جاسے گا لیکن کل جو صاحبہ انچارج ہیں وہ موجود نہیں، پانچ بجے چھٹی کر جاتی ہیں۔
ہم نے کہا: ہم عمر میں پہلی بار برلن آئے ہیں اور آج جا کر شاید نوٹ لیں
کچھ کرو کامریڈ ہمارے لئے؟

بچاری بہت اچھی تھیں۔ ہم نے بات میں زور پیدا کرنے کے لئے کہا
”ہمارے دادا یہاں آئے تھے۔ ان کا ذکر اور ان کے اخبار کا فوٹو اس میں چھپا
ہے (ہمارے مذہبی ہمارے دوست حبیب عالم کے دادا تو تھے) رشتے کے
حوالے سے ان کی دلچسپی بڑھ گئی اور بچاری نے ایک لمبا فون کیا۔ اور پھر خود اٹھ کر
گئیں۔ آدھے گھنٹے میں ایک فائل نکال کر لائیں۔ اور جولائی ۱۹۰۰ء کا برلینر ٹاگ بلاٹ

ہمارے سامنے تھا۔

ہمارے منشی جی، جولائی کو اس کے ایڈیٹر سے ملے تھے۔ اور ان کے بیان کے مطابق دوسرے دن کے پرچے میں پیسہ اخبار کا نوٹ چھپا تھا۔ ہم نے جولائی کا پرچہ نکالا۔ اس میں کچھ نہ پایا تو ۹ جولائی میں جہانکا کہ شاید پھر دس جولائی، گیارہ جولائی، بارہ جولائی، تیرہ جولائی، چودہ جولائی۔ آخر ایکس ہو کر غافل بند کر دیا محنت اکارت گئی۔ پیسہ اخبار کا عکس کیس نظر نہ آیا۔ جی میں طرح طرح کے دیکھے آئے منشی جی نے یونسی تو نہیں اڑادی تھی۔ احتیاطاً ہم نے سات کا پرچہ بھی دیکھ ڈالا۔ آٹھ، نو۔ دس کا ایک ایک کالم بہ نظر غائر پھر دیکھا۔ یہ تراشہ ہمیں نہ ملتا تھا نہ ملتا۔ آخر اس بی بی سے ہم نے کہا۔ ابھی اخبار لوٹا ہے نہیں۔ کل ہمیں وقت ملا تو پھر آئیں گے۔

دل میں عجب دہچکا تھا۔ سفر نامہ آکر دوبارہ پڑھا۔ اس میں وہی دوسرے دن کا حوالہ تھا۔ تیرہ کو تو منشی جی برلن سے چلے ہی گئے تھے، انہیں دھوکہ ہوا کیا؟

اگلے روز دیکھتا تو ہمیں ہسٹری کا میوزیم بھی تھا کیونکہ پہلے روز لاہوری میں اتنا وقت لگا کہ میوزیم بند ہو رہا تھا۔ لیکن قدم کٹاں کٹاں لاہوری ہی میں لے گئے۔ اب ہم نے سوچا کہ ٹھہر ٹھہر کر پورے جیسے کا پرچہ دیکھیں گے۔ چودہ کے بعد پندرہ جولائی کے شمارے کے آٹھ صفحے اٹھائے تھے کہ نویں صفحہ پر پیسہ اخبار اور اردو تحریر نظر آئی۔ ہم نے اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس لی منشی صاحب کے متعلق جو ذرا سی بدگمانی ہوئی تھی۔ اس پر افسوس بھی ہوا۔ یہ عکس پیسہ اخبار، یوم شنبہ ۲۷ اپریل

.. ۱۹ء کے انوارِ قلم کا تھا۔ سرخی تھی۔

”تعلیم اسلام حکومت انگریزی کی کیسی تویہ ہے؟“

سرخی کے نیچے ایڈیٹر کا نوٹ :-

”حال ہی میں دو یورپین آفسروں کے ایک جاہل سرحدی آدمی کے ہاتھ سے بلاوجہ قتل کئے جانے پر جو رائے میں پیسہ اخبار میں ظاہر کر چکا ہوں کہ ایسی شقاوت اور سفاہت کی کاروائی کسی طرح بھی یا عیبِ ثواب نہیں ہو سکتی۔ اور نہ کوئی سچا مذہب اس کو روا رکھ سکتا ہے۔ اس کی تائید میں ایک ضروری سرحدی ایشین کے تمام معترفہ طبقہ کے مسلمانوں کی رائے مجھے دستیاب ہوئی ہے۔ میں ان کالموں میں اسے نمایاں جگہ دیتا ہوں :۔..... (ایڈیٹر)

اس کے نیچے کی تحریر کس کے قلم سے ہے معلوم نہیں ہو سکا۔ کیونکہ کالم کا اختتام ایک نامکمل فقرے پر ہوتا ہے۔



رائٹ برادران سے رجب علی سرور تک

یورپ والوں کی خوابیاں اپنی جگہ لیکن یہ لوگ ہیں کم سواد ہو سکتا ہے ہم غلط لوگوں سے ملتے رہے ہوں۔ بہر حال ذاتی تجربہ یہی ہے کہ ہر چند ہم نے بات سے بات نکال کر جتایا کہ ہم شاعر ہیں کسی نے خاص اعتنا نہ کیا۔ ہمارا دیوان جیسا بتے ہیں ہم نے باندھا تھا ویسا بندھا ہے۔ ایک صاحب سے تعارف ہوا کہ یہ بھی مصنف ہیں۔ ہم نے اشتیاق سے پوچھا۔ کیا لکھتے ہیں آپ؟ شاعری؟ ناول؟ بولے جی نہیں۔ میرا مضمون الکٹر انکس ہے۔ ہم پوچھنے کو تھے کہ الکٹر انکس کیا ہوتی ہے؟ لیکن ازراہ مصلحت باز رہے۔ ایک ادارہ کتابیں تیار کر رہا ہے جو پاکستان بھی آئیں گی۔ ہم بھاگے بھاگے وہاں گئے معلوم ہوا دھاتوں پر کیمیائی اثرات دینڈنگ خراوا اور آئل ٹینکالوجی وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ ہم نے بہت کریڈ کی کہ ظلم بدیع و معانی کی کوئی کتاب بھی شاید ہو۔ اور صنعتوں ہی پر زور ہے تو صنعت تو شیخ مراعات انظیر بے نقط وغیرہ کئی صنعتیں ہم نے ایم اے میں پڑھی تھیں ان پر کچھ کام ہونا چاہیے۔ جیسا ہمارے ہاں ہو رہا ہے کہ ایک صاحب نے

کتاب لکھی جس کی ہر سطر اور ہر لفظ سے تاریخ نکلتی ہے۔ سن پجری یا سال عیسوی برآمد ہوتا ہے۔ لیکن حیات۔ یورپ والوں نے صنعت کے لفظ کے معنی ہی بدل دیئے ہیں۔ کہاں تو یہ شریف اصطلاح زبان و بیان کی باریکیوں کے لیے استعمال ہوتی تھی یا اب لوہے، فولاد، کیمیاوی کھاد تیل وغیرہ کے کارخانے صنعتیں کہلانے لگے ہیں۔

کچھ دنوں تو ہم لوگوں سے سائنس اور صنعت و حرفت وغیرہ کی باتیں سنتے رہے لیکن ایک دن ہم سے راز لگیا۔ ہم نے کہا یہ کیا آپ لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی وغیرہ کی رٹ لگاتے ہوئے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے بھی اس مخصوص میں بہت کام کیا ہے۔ میٹرک سائنس میں ایسی دستگاہ تھی کہ ایک ہمارے حکیم نے ایک صاحب کی بد معاشی کی ذرا تشخیص کر دی کہ تم نے تریبوز بت لکھا یا ہے۔ محض حقل اور تیانے کے زور سے اور محض یہ دیکھ کر کہ مریض کے بار دگر و تریبوز کے پھلکے بکھرے تھے۔ اسٹراٹومی یعنی علم حیثیت میں اب بیشک روس اور امریکہ وغیرہ کے حوصلے کھل گئے ہیں کیونکہ ہم میدان میں نہیں ہیں۔ ہماری توجہ دوسرے ضروری امور کی طرف ہے ورنہ ہمارے مدرسوں میں درس نظامیہ میں علم حیثیت بھی پڑھاتے تھے۔

ایک صاحب کو دلچسپی پیدا ہوئی، بولے یہ علم حیثیت کپلر اور کوپر نیکس وغیرہ والا۔ ہم نے استہزائیہ ہنسی ہنس کر کہا۔ یہ لوگ تو ابھی کل کی پیداوار ہیں۔ ہمارے حکمائے ان سے صدیوں پہلے ستاروں اور سیاروں وغیرہ کا سراغ لگایا تھا۔ بلکہ ستارے دیکھے ہی نہیں، یہ بھی تحقیق کیا کہ ان کا رفتار زمانہ پر اور لوگوں کی تمدن

پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس موضوع پر ہمارے ہاں اب بھی بے شمار تصانیف اور قسم
جستریاں موجود ہیں بلکہ بعضے ادا سے تو سال کے سال نئی جستریاں چھاپتے ہیں۔
جس میں برج محل، برج عقرب وغیرہ کے سعد و نحس کے ساتھ ساتھ خواہوں کی
تعبیری فائدہ دینے وغیرہ درج رہتے ہیں۔ جا بجا زلچکے بھی دیئے ہوتے ہیں۔
ان کے علاوہ ان میں صابن سازی اور بوٹ پالش بنانے اور پونڈ کریم اور قدتی
رنگ کا خضاب وغیرہ تیار کرنے کے نسخے بھی دیئے ہوتے ہیں جس سے اس
گمان کی ایک حد تک تردید ہو جانی چاہیئے کہ ہماری توجہ صنعتوں کی طرف نہیں ہے۔
اور ہم محض خیالی باتیں کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں سے ہڈی و خنوع نے جو لوگ یورپ جاتے رہے ہیں بس جانتے
تھے اور پھر پھر ا کے خالی ہاتھ آ جاتے تھے۔ ٹرانزسٹر، ریفریجریٹر، ٹیپ ریکارڈ
وغیرہ کچھ ساتھ نہ لاتے تھے۔

اس کی توجہ تو کوئی کرنا چاہے تو یہ بھی کر سکتا ہے کہ اس زمانے میں چھری
نہیں ہوتی تھیں کیونکہ اور کچھ ہم جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں تاویل کرنا خوب
جانتے ہیں لیکن حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ بس کتابیں اور سفرنامے وغیرہ
ملکتے تھے۔ مرتید احمد خاں گئے۔ کچھ تو اسلام کا مقدمہ لڑتے رہے میوہ کی
کتاب کے جواب فراہم کرتے رہے مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کی بدگمانیاں
فرد کرتے رہے اور واپس آئے تو سائیکس موسائی کی داغ بیل ڈال کر جسے
شروع کر دیئے۔ وہ تو اس زمانے کے مولوی ذرا مستعد تھے ان کی پھریت اور

کفر وغیرہ کو فوراً پکڑ لیا ورنہ میدان صاحب جانے کہاں تک جاتے۔ شیخ عبدالقادر
گئے تو اقبال کو خط لکھ مارا کہ ج

کام جو کر رہی ہیں تو میں انہیں مذاق سخن نہیں ہے

اور مخزن میں ایک مضمون بھی ملتا چوڑا لکھا کہ گھر سے نکل کے دیکھو۔

ہندوستان والو۔ ہر پھر کے پھر ذکر مولوی محبوب عالم کا آتا ہے کہ اچھے

خاصے پرانی وضع کے آدمی تھے۔ دانش تو بیشک یورپ جا کر نہ منڈوائی

اور گوشت کھانے میں بھی احتیاط کرتے رہے۔ فقط یہودیوں کی دکانوں سے

تو شر یعنی حلال کھانے یا سبز مایاں والیں کھاتے رہے اور ہمدی طرح ٹھنڈا

پانی پیتے رہے لیکن ویسے مغرب کی ترقی سے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

اپنے ۱۹۰۰ء کے سفر نامے میں برلن کے ٹیکنیکل ہائی اسکول کا ذکر کیا ہے ہم

نے بھی جا کر یہ اسکول دیکھا اگر بہ اب یہ یونیورسٹی بن گیا ہے لیکن عمارت وہی

پرانی ہے جو مولوی محبوب عالم نے دیکھی تھی۔ ذرا ان کا بیان سینے کیسے لٹو

ہوئے ان لوگوں پر کہ ہمارے کلاسکل طرز تعلیم تک کی قربانی کر دی۔

”جس چیز نے جرمنی کو بڑی شہرت اور عزت دی ہے وہ یہاں کا پانی لکھنی گم یعنی

ٹیکنیکل ہائی اسکول ہے۔ یہ مدرسہ ایک سو ایک سال سے جاری ہے۔ میں ساڑھے

پانچ گھنٹے برابر اس عالی شان تعلیم گاہ کی مختلف منزلوں اور درجوں کا طواف کرتا رہا۔

آدھا بھی نہ دیکھ سکا۔ آرگینک اور ان آرگینک کیمسٹری کے تجربے دیکھے۔ آج کل

یورپ کے تین ہزار طالب علم یہاں تعلیم پاتے ہیں سوائے ترکی کے یورپ کے

ہر ملک کے طالب علم یہاں ہیں۔ ایک عجائب خانہ میں ہر قسم کی مشین کا چھوٹا سا

نمونہ طالب علموں کے سمجھنے کے لئے رکھا ہے۔ لیکن ایک دوسری جگہ ایک مکان میں مشینوں کے برہنہ کے مختلف عمل اس کے مختلف حصوں سے دھائے گئے ہیں۔ عمارات اور پلوں کے ماڈل، وغنائی جہازوں کے نمونے نقشہ کشی، بخاری، علم رنگ کے لکچر کے کمرے اور خدا جانے اور کتنے کمرے اور لکچر روم، جرموں کا یہ کتنا ذرا بھی بے جا نہیں کہ اتنا بڑا مدرسہ اس فن کا دنیا میں کوئی دوسرا نہیں مسلمان بڑے ناز سے اب تک یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ قاسم کی الازہر یونیورسٹی میں ایک وقت میں دس ہزار طالب علم پڑھتے ہیں اور مراکو کے فیض کے دارالعلوم میں بھی کئی ہزار طالب علم پڑھتے ہیں۔ مگر بھلے آدمیو دیکھو تو سہی وہ کیا پڑھتے ہیں اور یہ کیا پڑھتے ہیں جن علوم کو الازہر اور فیض میں پڑھایا جاتا ہے وہ اب بوسیدہ ٹہریاں ہو چکی ہیں۔ کوئی ٹیبلٹ پڑھنے والے کو ذرا امریکہ کی مشہور بک یونیورسٹی کی رصد گاہ میں یا گرینچ (انگلستان) کی رصد گاہ میں بے جا کر مقابلہ تو کرے کہ وہ فرض علم ہدایت صحیح ہے یا یہ عینی مشاہدہ ستاروں کا عظیم الشان دور بینیوں سے۔ جو لوگ اس قسم کے مقابلوں کو پسند نہیں کرتے وہ مجھے محاف کریں۔

تو وہ طوبی و ماورقامت یار

منکر ہر کس بقدر ہمت اوست

آگے چل کر مولوی محبوب عالم دروہندی سے لکھتے ہیں :-

”اس ٹکنیکل اسکول کے محاسبہ کے دوران میں اس کی عظمت اور حاکمان کو

دیکھ کر مجھے اپنا آپ نہایت حقیر معلوم ہوتا تھا اور بالوسی ہمت کو ایسا پست کر رہی تھی کہ دل میں خیال گزرتا تھا کہ اس قسم کی زندگی کا تو خود کشی سے خاتمہ کر دینا

چاہیے جو ایسی ناکارہ ہے۔ یہ ایک ایسے سلسلہ خیالات کا نتیجہ تھا کہ جس کے
 یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں لیکن یہ تو مرد زردشتی کی طرح غی ہر ہے کہ
 ہندوستان میں مسلمانوں کی ایسی تعلیم گاہ ابھی دو صدیوں تک قائم نہیں ہوئی۔

صبح پوچھے تو آج کل ہمارا ایمان بھی ڈانٹا ڈوٹا ہوا ہے کچھ دن پہلے
 تک ہمارا خیال تھا کہ ہمیں سچے مسلمان بننا چاہیے۔ اور کچھ کہنے کی ضرورت
 نہیں اب ہمارا خیال ہے کہ سچے مسلمان بننے کے مدارج بھی بہت کچھ کوئی پڑے گا۔
 قوم کو صنعتی تعلیم دینی ہوگی کارخانے بنانے ہوں گے۔ اجتماعی فارموں میں زرخیزوں
 اور مہینوں سے کاشت کر کے پیداوار بڑھانی پڑے گی تاکہ ملک کی معیشت مستحکم
 ہو۔ سب اچھا کھائیں، پینیں ٹیلی ویژن جناب شیخ جی کے گھر میں کیوں جو مرید
 سادہ کے گھر میں کیوں نہ ہو یہ لوگ جو آج پڑھ لکھ کر کھڑے اور چراسمی کی نوکری کے
 لئے مارے مارے پھرتے ہیں۔ کل میکنگ اور خواتین ہوں گے تو اپنی خودی کو
 بھی بند کر سکیں گے۔ میرے آپ کے محتاج نہیں ہوں گے جب آپ کے کیفیت
 آباد کارخانے رداں، خزانے بھر پور اور لوگ خوش باش ہوں گے چرک خیال
 ہے جو کوئی جھسایہ یا غیر مہایہ ٹیڑھی نظر آپ کو دیکھ سکے۔ اس وقت
 سچے مسلمان بننے کا مزہ بھی زیادہ ہوگا۔ اس وقت تو

شب جو عتد نماز بر بندم
 چہ خورد با مداد نسر ز ندم

صاحبو! اور دن کی کیا کہیں۔ ہم نے بھی ساری عمر شاعری ہی کی بدترین

کی شاعری پر واہ واہ اور محترم ارشاد میں عمر گزار دی۔ کیا کریں ہماری تعلیم ہی سہی
 اور میر کے کلام سے شروع ہوئی۔ چھٹی جماعت کے اردو کورس میں میر تھے۔
 خواجہ میر درد تھے۔ آتش تھے، سوز و گداز تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے کہ ماسٹر
 گورو دیال سنگھ تھوڑی سائنس بھی پڑھا دیتے تھے جس سے کچھ تصور ایصال
 حرارت اور قوت انامیب شعری اور حیاتیات وغیرہ کا اب تک ہے اور یہ معلوم ہے
 کہ فارن ہائیٹ کیا ہوتا ہے۔ بکتاب میں پڑھے ہوتے تو۔۔۔ جھوم جھوم کر پڑھنا
 شام کو روٹیاں مانگ کر لانا۔ چھوٹے چھوٹے مسکوں پر لڑنا۔ مین میکہ نکالنا اور
 اس بات سے غافل رہنا کہ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی ہے۔ فضا میں کیا ہو رہا
 ہے، خلا میں کیا ہو رہا ہے۔ علم الکلام کے رموز تو استاد نے پڑھا دیئے۔ جابر
 بن حیان کا نام نہ بتایا۔

جب پکڑ اور گلیلیو آسمان میں تھگی لگا رہے تھے۔۔۔ ہم شاعری
 کر رہے تھے۔

جب واٹ اور اسٹیفن بھاپ کو غلام بنا رہے تھے۔۔۔ شاہ نصیر لدھی
 کی کوشش تھی کہ کوئی قافیہ بند سنے سے نہ رہ جائے۔

جب ایڈیسن اور مارکونی برق اور آواز کے دیوؤں کو اسیر کر رہے تھے
 ۔۔۔ ہم شعری گلدستے فتنہ اور عطر فتنہ نکال رہے تھے۔

جب رائٹ براڈران لکوں سے ہوا میں اڑ رہے تھے۔۔۔ ہم اور

رجب علی بیگ سرور نقیوں کے طوطے مینا بنا رہے تھے۔ ہر مصرع سے تاریخ
 نکال رہے تھے۔

اور جب امرکیہ اور روس نے آسمان کے لئے نئے چاند تارے بنائے ہم پرانے انتر شناس اب بھی جھڑیوں اور فاناموں میں اپنی قسمت کا حال دیکھ رہے ہیں۔ اب بھی ہمارے ہونٹوں کے بالا خانے عظام معالجوں ہر پوپ سے آباد ہیں۔ جاسیوں کے عہد کو گنتی صدیاں ہوئیں۔ جاگو اور دیکھو کہ اب کس پادشاہ کی پادشاہی ہے، بیچ میں قصیدہ گو، واسوخت گو، تانیہ پیا، منشی احمد حسین ثمر اور منشی محمد حسین جاہ توحہ درمیں گئے، لیکن مسلمانوں میں کوئی کوپرنیکس، ڈاٹ، ایڈیس اور مارکونی نہ ملے گا جس نے کی شاعری کی۔ مشاعرہ برپا کیا۔ گلدستہ سخن نکالا، یا پھرتے فرقتے پیدا کئے، مقتصد و غیر مقتصد کی مجلسیں، آئین بالجہر پر نفاذ ہوئے، ذبیحے اور مدیت ہلال پر آکر سفینہ کنارے لگا۔

ایسٹروم میں اور برلن میں ایسے ڈہانٹنٹل اسٹور دیکھے کہ پوری منزل کھلونے ہی کھلونے ہیں۔ ان میں گڑیاں گڈے بھی ہیں۔ لیکن تمام مشینوں کے ماڈل بھی دیکھے جن سے پتہ چلے کہ پسٹن کیا ہوتا ہے، گیئر کیسے کام کرتے ہیں۔ ابر کیا چیرہ ہے، ہوا کیلے۔ یہی التزام ہیاں کی کتابوں اور کورسوں میں ہے۔ یاد رہا کیا ہیں یہ قصے جن کو سینے سے لگائے پھرتے ہو۔ — فارسی کے شہزادوں کی کمائیاں ہیں۔ جہان عالم اور بددینیر کو کب تک روو گے۔ میر کی بے زری کا نہ کر گلہ خائف، رکھ تسلی کہ یوں مقتدر تھا کب تک ہماری نئی نسل کے کورسوں میں رہے گی۔ سکندر تو جب دنیا

سے گیا تب خال ماتھ تھا، تم تو دنیا میں خالی ماتھ ہو۔ غالب جیسے بھی ہستی کے قریب میں نہیں آئے۔ عالم کو حلقہ دم خیال جانتے رہے۔ اور ہم نے دنیا بھر کے علوم اس شاعر کے دیوان میں ڈالو نہ لئے۔ جیسے آریہ سماجی لوگ جیٹ ہوائی جہازوں کو ویدوں میں تلاش کر کے لاتے ہیں۔

اے صاحبزادے! دن بھر مصاحبوں کے جلو میں بیٹھے ناؤ نوش کرنے والے مجھ کو دیکھنے والے اور مشاعرے کو رانے والے کچھ غدر کے ساتھ کچھ پھلی صدی کے ساتھ گئے۔ کچھ پہلی جنگ میں قنا ہوتے کچھ دوسری جنگ کے ساتھ ختم ہوئے اور ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد تو ان کی ایک یاد سی باقی ہے، سو وہ بھی کیل ہے اچھا ہے یہ لوگ ختم ہوئے۔ اچھا ہے جم ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہار گئے ورنہ یہ بھی نہ ہوئے جو ہیں۔ مولوی محبوب عالم نے اپنے تاثرات اس وقت رقم کئے جب سرد خانوی راج کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ آزادی کا تصور بھی نہ تھا ان کو دو سو سال تک کچھ ہوتا نظر نہ آیا۔ بھرتیے، یوس نہیں، دست دباؤ بھی مضبوط رکھتے ہیں۔ موقع ملے تو ذہن کی جھوٹ میں بھی کم نہیں۔ اک ذرا یہ شاعری اور قناعت اور سوز و گداز اور وحدت الوجود اور مراعات الفیض اور رویت بطل وغیرہ کے مباحث نہ ہوں تو ————— !

ہالینڈ

۲۶ اکتوبر تا ۵ نومبر ۱۹۶۷ء

HOTEL ALBERS



کوہ (ہوٹل) البرز کی چوٹی پر

از ایسٹرڈم

بخدمت جناب معنی القاب قدرت اللہ شہاب سابق سفیر متعینہ الینڈ،

خیریت موجود خیریت مطلوب !

جناب والا ! کیا یہی ایسٹرڈم ہے جہاں ریمبراں وغیرہ پیدا ہوئے تھے؟
ان لوگوں کو کوئی اور جگہ پیدا ہونے کو نہ ملی تھی جیسا کہ خانے میں بستر پر اکڑوں
بیٹھے ہم یہ سطور رقم کر رہے ہیں اس سے تو کراچی کے ٹرام پٹے والے ہوٹل
ہزار درجہ اچھے جن میں محرت سنیا سی خوں والے سلیم اور قسمت کا کچا چٹھا
بتانے اور تقدیر بگاڑنے بنانے والے عامل کامل رہتے ہیں۔ وہ پروفیسر جن کے
کروں کے باہر لال آنکھوں اور سینگوں والے خوفناک جنوں، کھوپڑیوں اور
سفلی جانوروں کی تصویروں کے پھٹے لگے رہتے ہیں۔ ہم سیدھے مغربی برلن سے
آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے ٹوکیو سے میرپور خاص کی ٹکٹیوں میں پہنچ گئے ہوں
وہاں کی سڑکیں اسی صاف اور مجلا کہ ہم تو آئینہ دیکھتے ہی نہیں تھے۔ بس سڑک

میں اپنا منہ دیکھ لیتے تھے۔ انتظام ہمارا ایک ایسے شاندار ہوٹل میں تھا جس کے باہر شاندار وردیوں والے چوبدار بگلوں باندھے کھڑے رہتے تھے۔ بڑھ کر دروازہ کھولتے۔ بات بات پر اور بعض اوقات بلا بات کے بھی سیلوٹ کرتے۔ ہمارا سوٹ کیس اور ہمارے ناز اٹھاتے فیضیم بجاتے ایسی ٹھاٹ کے چاؤش تھے کہ ہمارا خود انہیں سلام کرنے کو بھی پابستا۔ مگرہ قالین والا، مکھنٹ۔ ایک طرف کو صوف پڑا ہے، مگرے کے ساتھ ہی اپنا ذاتی غسل خانہ، چاہے صبح سے شام تک اس کے اندر بیٹھے اخبار پڑھتے رہو۔ چاہے بے ثباتی دنیا پر غور کرتے رہو۔ کوئی بے جا مداخلت کرنے والا نہیں کیونکہ مگرے کے باہر تختی لٹکا سکتے ہیں *DON'T DISTURB* یعنی خبردار اگر کوئی اندر آیا۔ دروازہ ایسا کہ ذرا سا کواڑ آپ نے بھیڑا تو خود بخود تالہ لگ گیا۔ یہاں کے دروازے کی طرح نہیں کہ اتنی بڑی چابی سے بھی آسانی سے بند نہیں ہوتا۔ لفٹ موجود ہے۔ اپنی منزل پر نہایت جھلمل مھلمل کرتا ناشتے کا کمرہ بیرے سفید براق یونیفارم زیب تن کئے ہوئے (جیسی ہمیں نصیب نہ ہوئی) بات بات پر بلایں لے رہے ہیں۔ میس میزیں سرگرم رہے ہیں۔ اردو تو خیر نہیں باقی دنیا کی ہر مہذب زبان میں آپ کو مکھن لگا رہے ہیں۔ یہ بڑا شاندار لاؤنج جس میں ہم اپنی ترجمان مس فرنیسکا کو بٹھاتے تھے۔ یہ بی بی فرنیسکا ہمارے یہاں کے میزبانوں نے ہمارے ساتھ لگا دی تھی۔ کسی کا بچہ نہیں پڑھتی ہے۔ ہمیں ہوائی اڈے پر لینے آئی۔ چھوڑنے آئی۔ ہمہ وقت ساتھ رہی۔ ٹیکسی کا کرایہ بھی ہمارے

میزبانوں کے حساب میں خورد و خیرتی تھی۔ البتہ اس کو دوپہر کا کھانا ہم اپنے پتے سے کھلاتے تھے۔ خیر اس کا حلال نہیں کیونکہ ہم تو اس کا روٹی کپڑے پاندان وغیرہ کا پورا خرچ اٹھانے کو بھی تیار ہو جاتے۔ ویسے اس کو پینچ کھلانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ برلن سے رخصتی کے وقت ہوٹل کا بل دینے کے بعد ہمارے پاس بیروں کی فوج خفر موج کو بخشش دینے اور ایئر پورٹ ٹیکس ادا کرنے تک کا پیسہ نہ تھا۔ ہم نے وہ دو تین پونڈ ٹرڈ والے جو لندن والے لادنس میں سے آؤ مٹر کھا کھا کر اور پیدل چل چل کر بچائے تھے۔ گراہ برلن والے ہوٹل کا کچھ زیادہ نہ تھا۔ سولہ مارک روزانہ تھا۔ یعنی چار ڈالر اور یاد رہے کہ غسل خانے سمیت جس میں خوشبودار صابن کی ٹیکہ اور چار تویلے ہر روز بدلے جاتے تھے۔ ساڑھے تین مارک کا ناشتہ۔ ویسے ہم ریٹس ابن ریٹس ایک ڈا بھی ساتھ کھاتے تھے۔ جس کے کچھ پیسے مزید ہوتے تھے۔ اس پر پندرہ فی صدی صروس چارج۔ باوجود اس ٹھاٹھ باٹھ کے ہمارے روزینے میں سے جو ۴ مارک تھا۔ ہمارے کھانے (اور کھلانے) اور مشرقی برلن دیکھنے کے لیے کوئی بیس مارک رہ جاتے تھے۔ یہاں ہمارا روزینہ بتیس گھڈر، ہوٹل سولہ گھڈر۔ پندرہ فی صدی اس کے علاوہ کھانے کی ابھی نوبت نہیں آئی بس ات بکٹ کھا کر پانی پی لیا تھا۔ یہی میل دنمار رہے تو یہاں بسکٹوں اور سینڈویچ وغیرہ پر گزر ہوگی۔ کھانا کھانے کی نوبت اگلی منزل پر ہی آئے گی۔

اس ہوٹل کا انتظام ہماری ایئر لائن والوں نے (ہمارے خرچ پر) کیا تھا ایئر ٹرمینل سے کوئی آدھی فرلانگ دُور تھا، لیکن ٹیکسی والے نے کہا بھی ڈھائی

گلدڑ (ایک پونڈ میں دس گلدڑ سے کچھ کم ہوتے ہیں) ہو گئے۔ کراچی میں اتنے
 فاصلے کے پچاس پیسے ہوتے۔ ہمارے پاس خوردہ نہیں تھا۔ ہم نے تین ڈیڑھ
 اس نے جھٹ جیب میں ڈال لئے اور فرمایا : IS IT O.K.? - یعنی آدھا گلدڑ
 بخشش تم کافی سمجھتے ہو یا اور دو گے ؟ اس سے ہنگت کر اور سڑک سے خود
 ہی سوٹ کیس اٹھا کر اس دروازے پر پہنچے جس پر چھوٹی سی تختی البرز ہوٹل
 کی لٹی تھی۔ تو ہمارے گھنٹی بجانے پر اندر کھٹکا سا ہوا اور دروازہ کھل گیا۔ ہمارے
 ہوش ہوا ہو گئے۔ کیونکہ اندر کمرہ یا لابی یا دفتر نہیں تھا بلکہ میٹھیوں کا ایک
 لاتنا ہی سلسلہ حد نظر تک چلا گیا تھا اور تقریباً عمودی سلسلہ نوٹے کا نہیں تو ۸۵
 درجہ کا ضرور بنا ہوگا۔ عرض میٹھی کا تقریباً ۴۰ رانچ، پاؤں کی اگلی انگلیاں رکھ کر
 چڑھو پورا پر رکھنے کی گنجائش نہیں۔ ہم نوٹے کو تھے کہ اوپر اس کو میں کی
 منڈیر پر سے آواز آئی : گڈ آفٹرنون - دروازہ بند کر دینا۔ یہ وہ بڑھیا تھیں
 جو اس کی مالک، 'بیرا'، خانساں، بھارو بہارو والی غرضیکہ سب کچھ تھیں۔
 دروازے کی چٹخنی کے ساتھ انھوں نے اودان کی ایک رسی باندھ رکھی تھی۔
 جو دیوار کے ساتھ ساتھ کنڈیوں میں سے ہوتی ہوئی اوپر ان کے کمرے
 تک چلی گئی تھی۔ قسمت کا مارا مسافر باہر سے گھنٹی بجاتا ہے تو وہیں بیٹھے بیٹھے
 اس رسی کو ایک زور کا جھٹکا دیتی ہیں اور دروازہ کھٹ سے کھل جاتا ہے۔
 پھر تاکید کرتی ہیں کہ بند کر کے آنا۔ ہمارے کمرے تک آنے کے لئے ۷۵
 میٹریاں پڑتی ہیں۔ ہوٹل البرز سے شروع میں ہم سمجھتے تھے کہ یہ البرز کسی کا نام
 ہوگا۔ کوہ البرز کی نسبت کی طرف دھیان نہ گیا تھا۔ کمرے کے ساتھ غسل خانہ

اور دوسری حاجات ضروریہ غیر ضروریہ کا کیا سوال؟ اس سردی میں کمرہ گرم رکھنے تک کا انتظام نہیں۔ ایک پرانا بیڑا اٹھا کر لائیں جو بابا آدم نہیں تو ریلوین صاحب کے استعمال میں ضرور رہا ہوگا۔ فرمایا بہت سردی لگے تو اسے جلا لیتا۔ لیکن بجلی کا سوراخ ایک ہی ہے اسے لگا دو تو پڑھنے کا لیمپ بند کرو۔ دوسری عیاشی نہیں کر سکتے۔

ناشتے کے لئے پوچھا کہ کئے بچے کرتے ہو۔ ہم ذرا دیر خیز ہیں لیکن یہاں صبح بہت جلد ہی ہوتی ہے لہذا کہا۔ یہی کوئی آٹھ بجے۔ فرمایا۔ یہ تو بہت جلد ہی ہوا۔ سردی ہے میں ذرا دیر سے اٹھتی ہوں نو بجے کرو تو اچھا ہے جب معلوم ہوا کہ ہم پاکستان کے ہیں تو بولیں۔ پاکستان کے لوگ اس ہوٹل کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ایک مسٹر خان ہیں تم جانتے ہو گے وہ تو ہر سال یہیں آکر ٹھہرتے ہیں۔

یہ وہ شہر ہے جس میں آپ تین سال تک ہر ایک سی نفسی رہے۔ شاہے بیاں سفارت خانہ اور سفیر کبیر کا گھر ایک محل ہے جو جاری حکومت نے اچھے دنوں میں خرید لیا تھا۔ آپ کے اخلاق کو یہاں پر نظر کرتے ہوئے کچھ عجب نہ تھا کہ ہم بھی اس کے کسی کونے میں فروکش ہو جاتے اور ہفتہ بھر آپ کی روٹیاں توڑتے۔ آخر پاکستان سے جانے والے اتنے لوگ بھی کرتے رہے ہیں۔ بعضوں کو تو سنا ہے کہ آپ نے پُر زور اصرار کر کے اور پتے سے گویا دسے کر وطن واپس جانے پر آمادہ کیا تھا۔ ہم چھ سال قبل بھی کچھ دن اس شہر میں گزار گئے ہیں۔ ہوٹل اس وقت بھی کچھ ایسا اچھا نہ ملا تھا۔ لیکن کم از کم اس کا دروازہ اور دائیں کی رستی سے نہ دکھتا تھا۔

ہوٹل بائکلیشنل میوزیم کے ساتھ والی گلی میں ہے۔ یہ میوزیم انیسویں صدی کے وسط میں بنا تھا۔ گلی یا ہمارے اس ہوٹل کے مقابلے میں اس کی عمر جمعہ آٹھ دہائی جتنی چاہیے۔ آج ہمارا گزرا میسٹرڈم مٹن کے سامنے سے بھی ہوا۔ یہ ہمارے ہوٹل کے مقابلے میں بہتر معلوم ہوا لیکن ہم اپنا پانچ دن کا الائنس جمع کریں، تو وہاں ایک شب قیام کر سکتے ہیں یہ تو کر لیں لیکن یہ باقی کی چار راتیں کہاں گزاریں
 اے عجب دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں



ہالینڈ ہم کو پسند آیا

ایسٹرڈم تو جیسا ہے سو ہے۔ نہروں کا ایک جال ہے ہمارا خیال تھا نہروں کی یہ ایکلم خوبصورتی کے لئے رکھی گئی ہے۔ پتہ چلا کہ یہ بات نہیں۔ پہلے چھوٹا سا شہر تھا۔ بیرونی حملے کے ڈر سے نہر کھودی گئی۔ پانی تھے جو اٹھاتے جا سکتے تھے۔ آبادی بڑھی تو نہر کے دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ حویلیاں اور مکان بن گئے۔ اس کی حفاظت کے لئے پہلی نہر کے متوازی نہر کا دوسرا حصار کھینچا گیا۔ پھر تیسرا۔ پھر چوتھا۔ پانچواں۔ چھٹا۔ ساتواں۔ آٹھواں وغیرہ، اوریوں جس طرح درخت کے تنے کے حلقے دیکھ کر آپ اس کی عمر کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ایسٹرڈم کا نقشہ دیکھ کر معلوم ہو سکتا ہے کہ کتنی نسلیں اور کتنی صدیاں اس شہر پر سے گزری ہیں۔ گول مول بات ہم اس لئے بھی کر رہے ہیں کہ جس کاغذ پر اس شہر کا سال تعمیر نہروں اور پلوں کی صحیح تعداد وغیرہ لکھے تھے ہم سے کھو گیا ہے۔

ڈچ لوگ اور ان کا شہر ہمیں پسند آئے۔ یورپ کے بعض دوسرے ملکوں کی طرح ان لوگوں کو صفائی کا مجنون نہیں ہے۔ آرٹسٹ لوگ ہیں۔ لندن میں تو جگہ جگہ



ایستادہم کاترین یوزیم

لکھا ہے کہ اگر شرک پر تھوکا یا کاغذ کا کوئی پرزہ پھینکا تو ہم سے بڑا کوئی نہ ہوگا۔ ایفند
 میں اس قسم کی کوئی ناروا پابندی نہیں ہے، کئی بار تو یہ خوش گوار احساس ہوتا تھا کہ ہم
 اپنے ہی ملک میں کوئی چیز اجنبی نہیں۔ بارش ہے تو کچر ہے۔ کار بھی چسپ چسپ
 چھینے اڑاتی گزر گئی ہے۔ کوئی مکان تعمیر ہو رہا ہے تو جرمنی یا انگلستان میں اس کے
 گرد پردہ کھینچا پڑتا ہے۔ ہمارے ملک کی طرح یہ لطف نہیں کہ آپ فٹ پاتھ سے گزر
 رہے ہیں اور اوپر سے سینٹ اور ریت نیچے گر رہے ہیں۔ اینٹیں آ رہی ہیں۔ یہاں
 ایک فٹ پاتھ سے گزرتے ہوئے ہم پر اوپر سے گارا گرا تو پرچ یہ ہے کہ اس میں سے
 اپنے وطن کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو آتی۔ ملک سے دوری کا غم مٹ گیا۔ کاغذ
 چاک کر کے اس کے پرزے بھی ہم نے جہاں چاہا پھینکے۔ کسی کے ابد پر بل نہ آئے۔
 شرک کو بھی ہم نے جاویدجا کر اس کیا۔ جرمنی میں ہم لال تہی پرزک کر کرنا قیمتی وقت
 ضائع کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ بہت سے ہوٹلوں اور طعام خانوں میں بھی صفائی
 کا معیار ہمارے ملک کے ایرانی ہوٹلوں کا ساتھا، اس سے کم نہیں تھا۔ مانگنے والے بھی
 اتنے توخیر نہیں تھے جتنے صدر میں ملتے ہیں تاہم کہیں کہیں بے۔ شرک پر ایک ٹیٹلا سا
 کھڑا کر رکھا ہے جس میں گراموفون لگا ہے جو بلند آواز سے پُر سوز گانا گا کر راگبیروں کے
 دل میں جذبہ ترحم پیدا کر رہا ہے اور ایک شخص اپنا پیار لے ہوئے اس میں ککے چھکتا
 لوگوں کا راستہ روک رہا ہے۔ البتہ بیس ٹرا میں ان خاتون نے نئی بنا دی ہیں۔ ریمبراں
 کے عہد کی نہیں رکھیں۔ یا پھر تعلیم کا معیار اچھا ہے۔ کتابیں خوبصورت چھپتی ہیں جیری
 خاص متی ہیں، لوگ بااخلاق ہیں۔ نائی بھی اچھے ہیں۔ ہم نے یہاں آکر بال کٹائے۔ لندن
 والے نائی سے تو بہتر نکلا۔ پیسے بھی کم لئے، تھینک دیو بھی بڑے تپاک سے کہا۔

اں تو کئی تھاکہ ایسٹرم تو جیسا ہے سو ہے۔ ڈیفٹ اور لیڈن دونوں کی خوبصورتی
 نے ہمارا جی موہ لیا۔ ڈیفٹ تو ہم کام سے گئے تھے، ایک صاحب سے ملاقات کی ٹھہری
 تھی، اس کے بعد ہم نے از خود ٹاؤن ہال کے گرد کے حصے کا چکر کاٹا۔ ڈیفٹ میں
 ایک تو چینی مٹی کی صنعت پرانی ہے۔ ظروف پر ٹائلوں پر مٹی نقش کاری یہاں کا خاص
 فن ہے۔ وہی رنگ کہ مٹاں کی خصوصیت ہے، ڈیفٹ میں برتا جاتا ہے۔ اس کے
 علاوہ لکڑی کے جوتے زیادہ تر اب سیاحوں کی تفریح طبع کے لئے بنتے ہیں لیکن ہم
 نے ایک شخص کو پہنے ہوئے بھی دیکھا۔ معلوم ہوا سردیوں میں آرام رہتا ہے۔ لیڈن
 میں ہم کو علم کا شوق سے گیا تھا۔ کچھ ہمارا خیال تھا (جو غلط نکلا) کہ ایسا مکتوب یا آفت
 اسلام کی ترتیب و تدوین بھی لیڈن ہی میں ہوتی ہے۔ ہمیں بھی کچھ معلومات اسلام کی ہیں
 ہمارا ارادہ تھا ان لوگوں کو بتا کر آتے لیکن پتہ چلا کہ یہاں کے ایک ادارے کو فقط
 اس کی اشاعت میں دخل ہے۔ لائبریری کا اور ٹیل شعبہ دیکھنے کا بھی ہم نے خاص اہتمام
 کیا تھا۔ ہمارا خیال تھا وہاں جا بجا لوگ جتے پئے ڈچ بے میں عربی ندرسی بولتے نظر
 آئیں گے، لیکن ایسا نہ ہوا۔ لائبریری صاحب کچھ بھلا سا نام تھا ان کا، شاید عربی جانتے
 تھے۔ بہر حال کتابوں کے نام پڑھ پڑھتے تھے۔ ہم نے اردو کی کتابیں دیکھنے کی خواہش
 کی۔ فقط ماسکو کی چپی ہوئی اردو روسی لغت نکلی اور کچھ بھی نہیں۔ اس سے زیادہ کتابیں
 تو وہاں گورمکھی کی تھیں، گورمکھی کے متعلق بھی تھیں۔ ان عربی کا ذخیرہ کچھ ہے یا پھر
 چینی جاپانی کا۔ اور انڈونیشی ملائی کا۔ ہم کتب خانے کی کمنگی سے ضرور متاثر ہوئے۔
 اور اس میں شک نہیں کہ ڈچ زبان کی پرانی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔ جرمنی اور انگریزی
 کی کتابیں بھی خاصی ہیں۔ ہمارا شوق الف یلہ اور اس کے تراجم ہیں، سو چند نئے دیکھے۔

جو اور جگہ نہ ملے تھے۔ ان سے قطع نظر جیسے گئے ویسے ہی ہر پھر کے آگئے۔
 لیکن جس ڈیلیٹ اور لیڈن کی گلیوں کو چوں نے بہت متاثر کیا۔ خوبصورت ٹائلوں
 والے مکانات۔ ٹریڈن کے اندر سے بھی گزرتی ہے۔ سیر کرتے ہم پرانے ٹائون ہال
 کی طرف جانکھے۔ سڑک کے سرے پر ایک پون چلی بھی تھی۔ مکافوں کا انداز وہی ترحویں
 اٹھارہویں صدی کا۔ سکائی سکریٹروں یعنی فلک ناما مکافوں کی بدعت فقط راتروم میں
 دیکھی، کیونکہ وہ شہر عالمی جنگ کی بیماری میں طے کا ڈھیر رہ گیا تھا، نئی تعمیرات بند مہیب
 اور چوکور ہیں۔ ایسٹروم بھی پرانے تاجروں اور رئیسوں کی حویلیوں کا شہر ہے۔ لیکن
 لیڈن اور ڈیلیٹ کے ٹیلی پھتوں اور گیلری والے مکانات تو اپنی الگ ہی ولاؤیری
 رکھتے ہیں۔ خاصے سے بے نیاز گاؤں کی الھڑو شیزاؤں کی طرح۔

ایسٹروم کا مشہور ٹیون میوزیم جس میں مختلف استوائی ملکوں کے رہن سہن کا
 انداز دکھایا گیا ہے۔ ان کے ہوسات۔ گھر۔ گھروں کا سامان، زیور، ظروف بلبے گتے
 اوضاع اطوار۔ یہ ہم نے آنے کے پہلے ہی روز دیکھ لیا تھا۔ اتھولوجیکل میوزیم ہمارا
 خاص شوق ہیں۔ برلن کے فوکر کنڈے، یعنی معاشرتی میوزیم کا حال ہم نے مولوی محبوب نام
 کے سفر نامے میں پڑھا تھا۔ کشاں کشاں پہنچے۔ افریقی اور چینی جاپانی شے تو دیکھے،
 لیکن وہ شعبہ جو اس پر عظیم سے تعلق رکھتا ہے۔ مرمت کے لئے بند تھا، سخت
 بالوسی ہوئی۔ عمارت وہی ہے جو اس صدی کے آغاز میں تھی۔ مولوی محبوب عالم نے لکھا
 ہے کہ سپہ پنجاب کے متعلق ذخیرہ کافی نہ تھا۔ گو لاہور کے کیر سے بازار کی آٹھ آنے
 والی ایک چار پائی بھی پڑی تھی لیکن اس سے لوگ یہی نتیجہ نکالتے ہوں گے کہ ہندوستانی

صرف ایسی ہی چار پائیاں استعمال کرتے ہیں۔ ایک صادق الاخبار بہادر پور کا نمونہ سیالکوٹی کاغذ پر چھپا ہوا رکھا تھا۔ میں نے وہاں رکھنے کے لئے پیسہ اخبار اور انتخاب لاہور کے نمونے مع ایک لکھے ہوئے مراسلہ کے جو اتفاقاً میرے پاس تھا عجب گاہ کے اعلیٰ افسر کے پاس بجا دیتے جس نے مجھے بعد میں شکریے کا خط بھیجا۔

جہاں یہ میوزیم پورا نہ دیکھ پانے کی کچھ تلافی ایسٹرم کے ٹروپن میوزیم کو دیکھ کر ہو گئی۔ افریقہ اور انڈونیشیا کے شعبے خاصے بڑے ہیں اور ایشیا کے بعد اور ملکوں کے بھی جن کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ہمیں تو بہت اور سہانگی کو جھٹکنے میں ابھی کتنے قرن گلیں گے۔ ایک جگہ بدھوں کا عظیم ہیوتا ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ بیسویں صدی کی معاشرت ہے۔ ایک جگہ ایک پاکستانی عورت ٹھٹھے کے سیدھے برقعے میں کھڑی نظر آئی۔ بعض اور اسلامی ملکوں کے برقعے تو اور بھی کمال ہیں۔ لیکن پاکستان کے شعبے میں ایک عظیمہ کو ریشمی غراہ پہنے اور برس اٹھائے بھی دکھایا گیا ہے۔ ایک کونے میں ایک شعبہ اسلام کا ہے مسلمانوں کو نماز پڑھتے دکھایا گیا ہے۔ خانہ کعبہ اور حج کی رسوم بھی دکھائی گئی ہیں۔ اس شعبے میں مختلف مسجدوں کے نمونے بھی رکھے گئے ہیں۔ اور ایک طرف قرآن مجید اور اس کے تراجم مختلف زبانوں میں۔ اچھا اثر آفریں شعبہ ہے۔ براہ اور انڈونیشیا وغیرہ کے تو پورے گھر اور دکانیں ہیں۔ ان دکانوں میں نون تیل پورا اصلی ساز و سامان بھرا ہے۔ بس اندر دکاندار مصنوعی ہے۔

ہالینڈ کے راستوں میں تنہا

مجبے۔ آج چھ راتیں وہاں گزارنے کے بعد ہم ہوٹل البرز سے چلے آئے اور وہ بند ہو گیا۔ کم از کم عارضی طور پر کیونکہ اس ہوٹل میں ہم تنہا مسافر تھے۔ ناشتے کی واحد میز پر صرف ہمارے لئے ناشتے کا انتظام ہوتا تھا۔ فقط ہمارا بستر بچتا تھا۔ مسز البرز بازار سے فقط دو انڈے اور ایک ڈبل روٹی لاتی تھیں۔ ایک ہمارے لئے، ایک اپنے لئے۔ بلکہ ہمارا خیال ہے بازار جاتی ہی نہیں تھیں۔ کیونکہ ادوان کی رستی کے ساتھ ساتھ میڑھیوں میں ہم نے ایک اور تاریکی بندھی دیکھی جس کے سرے پر چھینکا ٹنکا ہوا تھا۔ انڈے ڈبل روٹی والا صبح صبح آکر گھنٹی بجاتا تھا۔ مسز البرز، ادوان کو جھٹک دیتیں اور دروازہ کھل جاتا وہ چھینکے میں سامان خورد و نوش رکھ کر اور گڈ مارنگ کا آوازہ بلند کر کے دروازہ بند کر دیتا۔ اور یوں یہ ہوٹل چل رہا تھا۔ اور ہم اس میں چل رہے تھے۔ اور گزرا یہ صبح ۱۵ فیصدی سردی کے دے رہے تھے۔ قاعدے سے یہ ۱۵ فیصدی سردی ہمارا سحر بناتا تھا کیونکہ ہوٹل کے مسافر دُعا دہ ہم خود ہی تھے۔ کاسمان



منظر بھی حسین، چہرے بھی حسین
 ایسے کہ کبھی دیکھے بھی نہیں
 پر اپنے لئے تو شہسود نہ ہی
 آتی ہے ہونہار جاتی ہے ہونہار



رُکنے کی نہیں جا۔ اُٹھ بھی چکو
 کسی اور نگر چلیں اُجسنبیو
 سینے میں لے سببے کی ڈکھن
 آتی ہے پون، جاتی ہے پون

اوپر چڑھنا اتارنا ہمارا کام تھا۔ دروازہ کھولتے بند کرتے ہم خود تھے۔ کوئی
 فن آتا تھا تو دوڑے دوڑے کاریڈور میں ہم جاتے تھے۔ صابون ہم اپنا برتے
 تھے۔ جوتے ہم اپنے خود پاس کرتے تھے۔ رات کو اس ہوٹل میں عجیب سناٹا
 ہوتا تھا۔ اس کی قیسری منزل پر ڈیوڑھی والے کمرے میں ہم نیچے نہ جانے کہاں
 مسز البرز۔ انگریزی بولتی ضرور تھیں لیکن زبان میرا اور کام میرا کی طرح خود ہی سمجھتی
 ہوں گی۔ ہماری خدمت نہ کر سکتے کہا انھیں ملال تھا کیونکہ بقول اُن کے اُن کی
 صحت اچھی نہ رہتی تھی۔ حالانکہ عمر اُن کی ۶۷ سال سے زیادہ نہ تھی۔ جیس اُن کا
 ہوٹل چھوٹے کا تعلق ضرور ہوا۔ لیکن یہ خوشی ہے کہ بیچاری کو اب کسی مسافر کے لئے
 ناشتے وغیرہ کا تردد نہ کرنا پڑے گا۔ کل صبح آرام سے پاؤں پیسار کے سوئیں گی۔
 یہ امر ان کم معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شامت کا مارا مسافر وہاں آنکھلے۔ ایک ذریعہ
 شخص آیا ضرور تھا۔ کمرے دیکھنے کے بعد بولا: اچھا میں ابھی آیا۔ لیکن ے

جو مجھے دیکھنے کو آتا ہے

پھر مجھے دیکھنے نہیں آتا

اب ہم میوزیم ہوٹل میں ہیں۔ جو بالکل ساتھ والی گلی میں ہے۔ مسز البرز سے
 ہم نے جھوٹ بولا ہے کہ ہم دوسرے شہر۔ بیگ میں جا رہے ہیں۔ کیونکہ اب
 ہمارا کام وہاں ہے، ایمسٹرڈم میں نہیں ہے۔ ہم سعدی کے چیلے ہیں۔ دروغ
 مصلحت آمیز کے تانک ہیں۔ ہمارا یہ اچھا صاف ستھرا کمرہ ہے۔ سیڑھیاں بھی ہوٹل
 البرز کے مقابلے میں آدھی۔ ہوٹل کا عالم بھی نہیں ہے کیونکہ نیچے سامان اٹھانے کو



شہر لیڈن کی ایک جگہ

ہری جلیٹ والے دربان۔ کونز پر دوڑ لیاں۔ ایک طرف کوناشے کا کمرہ اور دوسرا
 جس میں کلفت درویوں والے ہیئرت پھرت کرتے نظر آ رہے ہیں۔ مسافروں کی ریل پل۔
 مرکزی بینک بھی ہے۔ مسز ابرو نے ہمیں ہیئر لکھ کر جو آٹہ دیا تھا اس میں سے
 ہوا تو آتی تھی۔ گرمی ہم نے نہ دیکھی۔ اسے کئی بار اٹھا کر ہم نے گود میں بھی رکھا
 کچھ فائدہ نہ ہوا۔ شب بھر ٹھٹھرتے تھے۔ تو ایسے کی جگہ چار گرے کا ایک رومال
 تھا اور اس چار گرہ کمرے کی قسمت غالب یہ تھی کہ چھ دن میں تو بدلا نہیں گیا۔ واش
 بیسن میں ڈاٹ تو لگتی ہی نہیں تھی۔ دو ٹکڑے ہو گئی تھی اور گرم پانی کی ٹونٹی کھولنے
 تو کھولتے چلے جائیے۔ دو تین منٹ کے بعد ٹپکا شروع ہوتا تھا۔ غالباً پانی بھی
 سیدھا پائپ سے نہیں بلکہ سیڑھیاں چڑھ کر پائپا کا پائپا آتا تھا لیکن ٹھنڈا پانی تو
 خوب فوارے کی طرح آتا تھا۔ اس میوزیم ہوٹل کے کمرے کی دیوار کو ہم نے ٹوک دیا۔
 عسوس دیواریں تھیں بلکہ ایک پر تو لکڑی کے خوبصورت تخت بھی لگے ہیں۔ ہوٹل ابرو
 میں ہمارے کمرے کی دیواریں تحقیق نہ ہوا کہ کس مسالے کی تھیں۔ انگلی سے دباؤ
 تو اتنی دیوار اندر کو دب جاتی تھی۔ ہمارا خیال ہے موٹا کاغذ تھا اس کے پیچھے خلا تھا
 اور خلا کے پیچھے جانے لیا۔ کچھ نہ کچھ تو ہو گا۔ خلا کی کھوج لگانے کا جنون روسیوں
 کو ہے۔ ہمیں نہیں ہے۔

مصروفیت سینے کو صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے۔ عمر یونی تمام ہوتی ہے
 اور ہمارا کام تمام کرتی ہے۔ ہر روز ایک نئی منزل سر پر کھڑی مٹی ہے کل صبح
 ۹ بجے ایک صاحب سے ڈلفٹ میں ملنا تھا۔ ایسٹرڈم سے گاڑی ۵۴۔۷ پر چلتی

ہے اور ۵۴۔ ۸ پر پہنچا پاتا ہے۔ ۵۶۔ ۷ پر چلنے کے لئے اسٹیشن پر پندرہ بیس منٹ پہلے پہنچ کر ٹکٹ لو اور پیٹ فارم تلاش کرو۔ اس کے لئے آدھ میل دُور جا کر سولہ نمبر کی ٹرام پکڑنی چاہیے۔ اس کے لئے گھر سے کم از کم سات بجے چلو۔ اور چونکہ فیشن کا اختتام صفائی بھی ضروری ہے۔ یعنی شیو کرو۔ منہ اچھو دھوؤ۔ کپڑے پہنو تو چھبے اٹھو۔ یعنی نور کے تڑکے۔ ہم ہویشیاں یہ کیا جانیں؟ خیر مسز ابراز سے ٹام پس مانگے۔ ڈلفٹ گئے۔ انھوں نے پہلے ہی فون کر رکھے تھے ایک اور شہر میں راولپنڈی میں۔ نیا ٹکٹ لیا اور وہاں بھی جا اترے۔ وہاں کے کام جھگڑتے تو پھر ہلکے آئے۔ کیونکہ ہلکے کے پاس ایک قصبہ ہے جہاں وزارتِ خارجہ کے دفاتر ہیں اور وزارتِ خارجہ کے ایک افسر ہماری ملاقات کا اشتیاق رکھتے تھے بشرطیکہ ہم ان کے پاس پہنچیں۔ یہ تجربہ ہم کبھی نہ بھولیں گے۔ یہاں کے لوگ بے حد بااخلاق ہیں۔ اگر ان کو کوئی راستہ معلوم نہیں تو بھی مکہ سا جواب نہ دیں گے بلکہ کچھ نہ کچھ بتائیں گے ضرور۔ کوئی نہ کوئی ٹرام کا نمبر بتا دیں گے۔ بس نمبر بتا دیں گے۔ یا انکلی سے کسی طرف اشارہ کر دیں گے۔ چنانچہ کسی نے ہم سے کہا۔ دس نمبر ٹرام لو۔ فور برگ کے سٹیشن پر پہنچے گی۔ وہاں کسی سے بھی پوچھ لینا۔ وہاں اترے اور کسی کو پتے کی چٹ دکھائی تو بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور بیک وقت چاروں سمتوں میں اشارے کرنے لگے۔ آخر ۲۲ نمبر کی بس لی۔ اس کے ڈرائیور نے ایک جگہ تار دیا اور کہا۔ یہاں کسی سے بھی پوچھ لینا۔ اس سڑک پر دُور دُور تک آدم نہ آدم زاد، اور بارش۔ اور سردی اور ہول کے جھونکے۔ کوئی نئی بستی تھی۔ ایک لڑکا ایک مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ ہم ڈگ بھرتے وہاں ابھی پہنچے نہ تھے کہ سائیکل پر چڑھ کر ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ ایک اور صاحب

کی طرف ہم بھاگے۔ دوچار اٹھ لب بام رہ گیا تھا کہ وہ ایک بس میں سوار ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ایک بھلے مانس کو چور ہے میں کاغذ دکھایا۔ اتنے میں ان کے مطلب کی جتنی بیز ہو گئی۔ اور وہ ہمیں کاغذ لہراتا چھوڑا راستہ عبور کر گئے۔ خیر بادشہ سردی ہوا کے باوجود ایک صاحب نے رک کر کہا۔ یہاں تو تمام گھر ہیں۔ کوئی سرکاری دفتر ادھر نہیں ہے۔ ہم نے ایک اونچی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ تو بولے 'ہاں وہ البتہ سرکاری دفتر ہے لیکن معلوم نہیں کابے کا ہے۔ خیر ہمیں اطمینان ہوا کہ وہ دفتر مطلوبہ نہ ہوا تو کم از کم پتہ تو ملے گا۔ وہاں کا دربان واقعی خضر راہ نکلا۔ انگریزی نہیں جانتا تھا۔ لیکن میز کی دراز میں سے ایک انگریزی میں چھپی ہوئی پرچی نکال لایا۔

”جہاں آپ کھڑے ہیں وہاں سے فلاں سڑک پر چل دیجئے۔ واسے اٹھ کی پہلی دو گلیاں چھوڑ کر تیسری پر بایں اٹھ مڑیے۔ وہاں سے پہلی گلی دہنی طرف پار کیجئے اور آخری بار بایں اٹھ مڑ جائیے۔ وزارت خارجہ کی عمارت بالکل سامنے ملے گی۔“

معلوم ہوا ہمیں کو نہیں — یہ مسئلہ اور لوگوں کو بھی درپیش ہوتا ہے۔ اس لئے پرچیاں پھیلائی گئی ہیں۔ بہر حال شکریہ ادا کر کے ہم چل دیئے۔ دو گلیاں چھوڑ کر تیسری پر بایں اٹھ مڑے۔ پھر واسے اٹھ مڑے اور پھر آخری بار بایں اٹھ مڑے تو آگے کچھ بھی نہ تھا۔ ریل کی لائن تھی — اور اس پار خالی کھیت تھی۔

مائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے۔ ان صاحب سے ملنا بھی ضرور تھا کیونکہ بات ہمارے مفاد کی نہیں۔ ہمارے ملک کے مفاد کی تھی۔ شام بھی ہو رہی تھی پھر

ہم بس کا راستہ بھی بھول چکے تھے۔ پھر ٹرام ایسی تھی۔ پھر ہلک سے گاڑی پکڑ لی تھی۔
پھر ٹرام ایسی تھی۔ پھر بیدل چلنا تھا۔ پھر سنز البرز کے ہوٹل کی، ۵ سیڑھیاں چڑھنی
تھیں۔ منزل تیری دُور مسافر، منزل تیری دُور۔

آخر جب ہم یو ایس ہو چکے تھے۔ آٹا فائدہ دفتر میں مل گیا۔ صاحب موصوت
البتہ نہیں تھے۔ ہم خستگی سے بے ہوش ہونے کو تھے کہ وہ آگئے۔ بوسے امید
ہے آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہوگا اور بیاں کا راستہ آسانی سے مل گیا ہوگا؟
ہم جی کر اکر کے چہرے پر مسکراہٹ لاتے اور کہا: جی ہاں!

آج شام ہمیں علم کا شوق اور فرض کی محنت یاد دل گئی۔ وہاں سبھی بارش
میں شراہور چھپ چھپ کرتے آئے اس وقت ہمارا کوٹ وارڈ روم میں لٹکا
نچڑ رہا ہے اوجھتا بھی۔ کل صبح پھر شہر سے باہر ایک اپارٹمنٹ منٹ ہے۔ ہمارا
جی ابھی سنے ہول کھارہا ہے۔ آپ کہیں گے ہم کیوں نہیں فون کر کے ٹیکسی
طلب کرتے۔ ٹانگ پڑا ٹانگ رکھ کر اور پتے کی پرچی ڈرائیور کے حوالے کر کے
نچنت ہو جاتے اور سگریٹ سلگا لیتے، وہ جاتے اس کا کام۔
ہمارے اس تھوڑا کھسے کو بہت جانیے کہ اس کی وجوہ اقتصادی ہیں۔



ایسٹریڈیم کے رستہ میوزیم میں

ہمیں بھی آرٹ سے رغبت ہے

ایسٹروم ہیں جب ہم اپنے کاموں سے کچھ کچھ فارغ ہوئے تو ایک صاحب سے ہم نے پوچھا۔ اب ہمارا یہاں سے چل چلاؤ ہے ہم نہیں چاہتے کوئی چیز ہمارے دیکھنے سے رہ جالتے۔ یہاں کی کیا چیزیں مشہور ہیں؟
 بوئے: ”پینر“

ہم نے کہا: ”وہ ہم نے کھا لیا، بلکہ قدرت اللہ شہاب صاحب کے ہاں کھا کے آئے تھے۔ وہ دو تین سال کا ذخیرہ اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“
 ”دوسری چیز یہاں کی پونی چکیاں ہیں۔“

ہم نے کہا: ”وہ بھی دیکھ لیں۔ اور؟“

سوچ کر بوئے: ”یہاں کے پینٹر مشہور زمانہ ہیں۔“

ہم نے ان کے گھر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی چوکھٹ پر ہاتھ پھیرا۔

بوئے: ”میرا مطلب دروازوں، گھر کیوں پر زنگ کرنے والوں سے

نہیں ہے۔ پیٹر تم نہیں جانتے کیا ہوتا ہے؟

اب کچھ کچھ ہماری سمجھ میں آیا۔ ہم نے کہا ”معاذ کرنا۔ اب ہم سمجھے۔ ہمارے ان بھی بڑے اچھے اچھے پیٹر ہیں ایک سے ایک عمدہ سائن بورڈ آپ کو نظر آئے گا، بلکہ شہر کی دیواروں پر لکھنے والوں میں ایک نامی گرامی پیٹر اللہ دیا تمناؤں ہمارے پڑوس میں رہتا ہے۔ شاعر بھی ہے۔ مگر اس کا تخلص ہے تخلص جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟

فرمایا: ”میرا مطلب دیواریں چھاپنے والے سینما کے بورڈ بنانے والے پیٹروں سے بھی نہیں ہے۔ ریمران کا نام تم نے سنا ہے۔“

ہم نے کہا: ”ایک ہفتہ تو ہمیں یہاں آئے ہو ہے۔ اس میں بھی زیادہ تر مصروفیت رہی کپ کیے توقع کر سکتے ہیں کہ رام رام — کیا نام بتایا تم نے اس کا؟“

انھوں نے دو کھپے پن سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ریجن میوزیم یعنی قومی میوزیم بالکل ہمارے میوزیم ہوٹل کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ معلوم نہیں ہمارے ہوٹل کا نام اس کی وجہ سے رکھا گیا ہے یا یہاں میوزیم ہمارے ہوٹل کی رعایت سے بنایا گیا ہے۔ بہر حال جس کسی سے بات ہوئی اُنہیں نے ہم سے یہی پوچھا۔ تم نے ریجن میوزیم دیکھا کیا؟

آخر ہم نے سوچا، دیکھ ہی ڈانچا ہے۔ ہفتہ کی صبح ہماری خالی تھی۔ جا گئے معلوم ہوا تصویروں کا میوزیم ہے۔ کچھ مجھے ہیں اور پرانا کلاک کبار فریئر

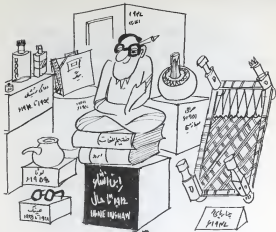
بھی ہے۔ سوھویں صدی کا۔ سترھویں صدی کا۔ ہم قویہ کرتے ہیں کہ کوئی چیز پرانی ہوئی۔ مثلاً چارپائی ٹوٹنے لگی یا کرسی کا ہتھا اکھڑ گیا تو اسے پھینک دیا یا آگ بجلائی۔ مغربی ملکوں میں ایسا نہیں کرتے۔ پرانی چیزوں کو سنت سنت کر رکھتے ہیں چنانچہ کئی کمرے پرانے فرنیچر سے بھرے ہوتے دیکھے۔ ہمارے گھر میں بھی پندرہ پندرہ بیس بیس سال کے کھٹوٹے۔ میز۔ ٹرنک۔ بدھنے۔ مرتبان۔ کیلنڈر۔ چھپے۔ سرے دانیاں۔ توشک وغیرہ بھرے پڑے ہیں۔ ہمیں ان کی قدر و قیمت کا خیال نہ آیا۔ اگر ہمارے آنے تک۔ ہمارے گھر والوں نے پھینک نہ دیئے ہوں تو ہم بھی میوزیم بنائیں گے۔ یہ چیزیں تو پھر حال کی ہیں۔ بعض میوزیموں میں تو ہم نے چھپیں پھپیں تیس تیس صدی پرانی اور بے کار چیزیں بھی دیکھیں۔

ہم نے کہا: ”یہ کچھ نہیں۔ کچھ اور دکھاؤ“

تب ایک گائیڈ نے ہمیں ویلفٹ کی پرانی ٹائلوں کا ذخیرہ دکھایا۔ اس وقت تو ہم نے تعریف کی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ویسی ہیں جیسی شرکت صدیقی نے اپنے پھانگ کے ستونوں پر لگا رکھی ہیں، کوئی کمال کی بات نہیں۔

اس کے بعد تصویروں کے کمروں کا نمبر آیا۔ ہم نے سنا تھا کہ ریمبران نامی مصور نے ٹائٹ وائچ نام کی جو تصویر بنائی تھی اس کی وجہ سے یہ میوزیم دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ریمبران کی بہت سی اور تصویریں بھی اس میوزیم میں بتائی گئیں ایک اور شخص کی بھی جس کا نام فان گوگ یا ایسا ہی کچھ تھا جس شخص کا نام ایسا عجیب و غریب ہو رہا تھا کیا تصویریں بناتے گا۔

خیر ہم نے میوزیم لاٹکٹ خریدا تھا۔ اب تصویریں دیکھنی تھیں۔ ہم نے



کراچی آرٹ کونسل میں تصویروں کی کئی نمائشیں دی گئی ہیں اور خود بھی ایک زمانے میں آرٹ سے شغف رہا ہے جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے۔ ماسٹر محمد دین جہری ڈرائنگ کی کلاس دیا کرتے تھے اور ہم سے سبب کیلئے انگلیں مارتے تھے اور مود و غیرہ بنوایا کرتے تھے۔ ہمارا ہاتھ ہمارے ہم سبقوں میں سب سے زیادہ رواں تھا۔ خود ماسٹر محمد دین بڑے باکمال آرٹسٹ تھے۔ لیکن ہاتھ بے قدر ہوا زمانہ۔ ہمیں تو کوئی کیا جانے گا آج کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا۔ سوائے ان کے شاگردوں کے۔ وہ بھی شاید اسی لیے کہ مارتے بہت تھے۔



اس میوزیم میں کمرے ہی کمرے ہیں۔ سب تصویروں سے بھرے ہوئے بعض
تصویروں کے چوکھٹے بے حد خوبصورت ہیں۔ جی چاہتا تھا کہ چوکھٹا نکال لیں اور اس
میں اپنی تصویر لگائیں۔ ایک تصویر میں ایک شخص تلوار لگائے کھڑا تھا۔ پیچھے چاند بھی
نکلا ہوا تھا۔ ہم نے کہا۔ یہ "نائٹ وچ" ہے؟ بڑی خوبصورت تصویر ہے۔
معاذ نے بتایا۔ "نہیں! یہ نائٹ وچ نہیں ہے۔ وہ تو ریمبران کا شاہکار
ہے۔ گیلریوں میں چلتے جاؤ۔ آگے ملے گا۔"

آگے ایک کمرے میں ایک کلاک کی تصویر تھی۔ ہمیں خیال آیا شاید وچ سے

مطلب کھڑی ہو۔ ہم نے اس کمرے کے محافظ سے کہا: ”یہ تو نہیں ریمبران کی
’نائٹ وارج‘؟“

معلوم ہوا: ”یہ بھی نہیں ہے، آگے ہے۔“
خیر تصویریں دیکھتے نام پڑھتے، تجسین اور آفرین کے طور پر سر ہلاتے ہم ایک
بڑے ال کمرے میں پہنچے۔ بہت سے لوگ ایک تصویر کے گرد کھڑے تھے۔ کسی
نے ہمیں اشارے سے بتایا: ”یہ ہے ریمبران کی ’نائٹ وارج‘۔“

بہت بڑی تصویر ہے۔ پوری دیوار ڈھانپ رکھی ہے۔ دوسروں کی طرح ہم
نے بھی اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، جھٹک لگا کر دیکھا۔ جھٹک اتار کر دیکھا۔
اس کمرے میں اس تصویر کو دیکھنے کے لئے صوفے بھی لگائے گئے ہیں۔ ہم نے بھی
ان پر ٹھکی لی۔ اس میں سامنے ایک بادشاہ ہے۔ ہمارے خیال میں تو بادشاہ ہی
ہوگا۔ ساتھ ایک ٹوپی والا جرنیل سمجھ لیجئے، ایک شخص بندوق لئے بھی کھڑا ہے۔
تصویر کے دہنے اٹھ ایک ڈھول والا ہے۔ چھپے کی جگہ بھرنے کے لئے کچھ اور
آدمی بھی دکھائے گئے ہیں کسی کا منہ کسی طرف کو ہے۔ کسی کا کسی طرف کو.....
ذرا ٹھہرتے۔ کتاب میں دیکھیں۔ ہم نے میوزیم کی گائیڈ بھی تو خریدی ہے۔ دیکھئے
صفحہ ۱۵۔ اور ۱۶۔ ”ریمبران۔ ریمبران۔ (۱۶۰۶-۱۶۹۹) اپنے زمانے کا
بہت بڑا آرٹسٹ تھا (بے شک اپنے زمانے کا ہوگا۔ ہم نے سوچا) لیڈن کا رہنے
والا تھا۔ پھر امسٹرڈم چلا آیا اور جب تک مرنے لگا۔ وہیں رہا۔ اس کی بنائی ہوئی
تصویروں میں یہودی دلہن۔ پطرس ولی کا انکار (.....) اسے یہ کیا فضول۔
تفصیلات ہیں ’نائٹ وارج‘ کا ذکر آنا چاہیئے (.....) یہ رہا دیکھنے والا لکھتا ہے کہ ریمبران

کو نابالغ (یعنی یقین نہیں ہے اور گائیڈ لکھنے بیٹھ گئے ہیں) اس وقت یہ تصویر بنانے کو کہا گیا تھا جب فرانس کی بیوہ ملکہ میراڈی میڈسٹی ۱۶۳۹ء میں ایسٹرم آئیں۔ یہ تصویر کپتان فرانز ہینگ کوک اور لفٹیننٹ ویسٹمن ہانڈلبرگ کی کمپنی کی ہے۔ لیجئے جن کو ہم نے بادشاہ اور جرنیل سمجھا تھا وہ فقط کپتان اور لفٹیننٹ وغیرہ تھے۔ آنا برا آرٹسٹ۔ کسی کرنل جرنیل کی تصویر بنائی ہوتی تو ایک بات تھی چلتے یہ بھی تحقیق ہو گیا کہ تصویر حسب فرمائش بنائی گئی ہے، اپنی مرضی یا شوق سے نہیں ایسا کام تو پھر ٹالا جاتا ہے۔ کتاب بند کر کے ہم نے تصویر پر پھر غور و فکر شروع کیا۔ دیکھا کہ اس میں گہرائی پیدا ہو رہی ہے۔ لوگ زندہ اور جاگتے معلوم ہو رہے ہیں۔ پیچھے تاریک محراب نے سارے منظر کو ابھار دیا ہے۔ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا۔ گویا بڑی تصویر نہیں۔ کم از کم ہماری رلنے تو یہی ہے۔

ٹائٹ ڈائج ویکولی نیشنل میوزیم میں کچھ اور شعبے بھی تھے۔ ایک پرنٹ روم۔ ایک ڈول ڈاؤس! اب یہ دیکھنے باقی تھے۔ ایک جگہ کچھ چینی جاپانی کتابیں اور خاکے سے پرے تھے۔ ہم نے محافظوں سے کہا۔ تصویریں تو ہم نے ساری دیکھ لیں۔ یہ پرنٹ روم کہاں ہے؟ کس طرف کو ہے؟ کدھر ہے؟

بولنا: ”جناب! یہی تو پرنٹ روم ہے“

آگے پھر ایسی واردات ہوئی۔ ہم نے ڈول ڈاؤس کا پتہ پوچھا۔ محافظ بولا۔

”حضور! آپ اس وقت ڈول ڈاؤس میں کھڑے ہیں“

ہم نے کہا: ”باہر جانے کا راستہ کون سا ہے“

اس نے ایک طرف کو اشارہ کیا۔ ویسے EXIT لکھا بھی تھا۔

ہم نے صدر دروازے پر اپنا کوٹ لیا۔ چوکیدار کو ٹپ دی اور باہر نکل آئے
 باہر خوشگوار موسم تھا۔

سوشلزمز لیننڈ

۶ نومبر تا ۱۱ نومبر ۱۹۶۷

RECEPTÖ



ہوٹل سان سان سان

انسان بھی کیسا پکھیر دے۔ صبح ہم ایسٹرڈم میں تھے، اس وقت جنیوا میں ہیں بلکہ دوپہر سے پہلے ہی آن اترے تھے۔ اتوار کا روزہ ہمیں یہ توخیر توقع نہ تھی کہ کوئی مار ٹھکرتے جھنڈیاں اور ڈھول تماشے لے کر ہمارا استقبال کرے گا۔ ان کرنٹوں کو ہماری قدر کیا معلوم۔ تاہم اب تک یہ ہوتا تھا کہ عموماً ہوٹل کی خبر ہوتی تھی۔ یہ معلوم رہتا تھا کہ کل کہاں کس سے جا کے ملا ہے بعض اوقات یورپ والے پریسیوں کو طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں۔ یعنی ہم فرنیفرٹ میں آکے اترے ہیں اور دارالحکومت ان لوگوں نے بون بنا رکھا ہے سوئٹزرلینڈ میں جنیوا اچھی جگہ ہے۔ ہمارے جہاز کو ہمیں اترنا ہے لیکن سوئٹزرلینڈ کی حکومت جہاں تک ہمارا خیال ہے برن میں ہے۔ سو ایکجوکیشن کے انٹرنیشنل بورڈ کا نام تو ہمیں معلوم تھا اور یہ کہ ہمیں وہاں جانا ہے لیکن یہ پوچھنا ہم بھول گئے تھے کہ کہاں ہے۔ کس نگر میں ہے۔ خیر ہم نے سوچا اس وقت تو کہیں ٹھکانہ ڈھونڈ کر صبح معلوم کریں گے۔ برن جانا پڑا تو جائیں گے۔

پس ہوس اتر کے کونٹر پر بیٹھی کوئی نار سے ہم نے کہا کہ قربانت ٹوم۔ ہمیں کوئی ہوٹل آباد۔ مفت کا ہو تو کیا کہنے ورنہ ہم کرایہ بھی تھوڑا بہت دینے کو تیار ہیں۔ ہو فٹ کاس غسل خانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوٹل بھی اس پاس چاہیے جہاں ممکن ہو تو ہم اپنا سوٹ کیس خود اٹھا کر لے جاسکیں اس کے علاوہ اس بی بی نے کہا "آج تو اتوار ہے۔ آج تو ٹورسٹ دفتر تک بند ہیں جو اس قسم کے انتظام کیا کرتے ہیں۔ میں کیا کر سکتی ہوں"

ہم نے کہا "کچھ نہیں ہو سکتا؟"
بولیں "کچھ نہیں"

ہم نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور کہا۔ "تو آج کی شب اسی پنج پر نہ استراحت کر لیں"

گھر اگر کہنے لگیں "نہیں نہیں، تھریئے میں کوشش کرتی ہوں"
اب اس نے ایک فہرست دیکھی۔ ایک دو جگہ فون کیا اور پھر کہا "ہوٹل ساں ساں میں چلے جاتیئے۔ نکرٹ پر ہے"
ہم نے کہا "یہ کیا نام ہوا۔ جہیں لکھ کر دو"

وہ ساں ساں نہیں تھا۔ ہمارے ہی کان ساں ساں کر رہے تھے۔

ساں یروے تھا ST. GERVAIS انگریزی تاعددے سے سینٹ جرویس ہونا چاہیئے۔ جرویس صاحب کوئی سادھو سنت ہوں گے مسیحی مذہب کے۔ ایک نشتے پر اس بی بی نے نشان بھی کر دیا کہ اس ماسٹے کے چوک کو پار کر کے گر جاٹے گا۔ اور اس گرجا کے بس پیچھے ہے۔

ہم خوش خوش سوٹ کیس اٹھائے باہر نکلے تو اس چوک کے چاروں طرف
 گرجا نظر آئے۔ چاروں طرف تو خیر نہیں تین طرف۔ کیونکہ چوتھی طرف سے تو ہم
 خود آرہے تھے۔ جو ایرٹرمنیل بھی تھا اور جینیوا کا بڑا ریوے اسٹیشن بھی بیٹھ کر
 نقشے کا مطالعہ شروع کیا۔ کچھ اس کا اٹنا سیدھا سمجھ میں نہ آیا۔ خاصی غفلت سلیم خرچ
 کی تو سمجھ میں آیا کہ وہی طرف کو جانا ہے۔ تھوڑی دیر غور کرنے پر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ
 ہمارا واپاں ہاتھ کون سا ہے۔ چنانچہ ادھر کو رواں ہوئے۔ گر جا کے چاروں طرف
 گھوم گئے۔ کبھی کبھ مرے پیچھے تھا، کیسا مرے آگے۔ کبھی کیسا مرے پیچھے تھا اور
 — خیر۔ آخر تھک گئے۔ اس نام کا ہوٹل نہ ملا۔ ہاں اور ناموں کے ہوٹل ضرور
 نظر آئے۔ آخر ہم نے سامان باہر رکھا اور ایک رستوران میں گھس گئے اور جیسے
 سے کہا: ”ہوٹل ساں یروے کے صحرے موسیو۔“

ہم تو خیر فریخ میں اتنی دستگاہ رکھتے تھے کہ اس شخص کو بشر کی بجائے موسیو
 کہہ کر خطاب کیا لیکن وہ شخص انگریزی سے بالکل ہی کوڑا نکلا۔ کانڈھا جھٹک کر رہ
 گیا۔ ایک اور شخص جو بیٹھا چائے پی رہا تھا البتہ ازراہ ہمدردی تین چار منٹ تک
 بڑی وضاحت سے ہمیں یہ بتایا۔ لیکن وضاحت چونکہ زبان فرانسیسی تھی اس لئے
 ہم مرمی کہہ کر باہر نکل آئے کہ کسی اور سے پوچھیں گے، یا کسی اور ہوٹل میں چلے
 جائیں گے۔

اور ہم نے یہی کیا۔ ایک ہوٹل میں گھس گئے اور کہا۔ ”کرہ چائیے بنگل و جی
 کرائے کا۔“

مینجر نے کہا: ”واجبی کرائے ہی کا ہے۔ ۵۲ فرانک روزانہ۔ ۱۵ فیصد سروس۔“

اس کے علاوہ ناشتے کے پیسے اسی کرائے میں شامل ہیں الگ نہیں ہوں گے۔
 اس آخری پیشکش کا تو ہم نے موزوں الفاظ میں شکریہ ادا کیا لیکن ہمیں
 جو روزینہ ملتا ہے اس کے حساب سے ہمیں ۱۵۔ فرانک کا کمرو چاہیے تھا۔ حد
 سے حد سب کچھ ملا کر ۲۰ فرانک کا۔

آخر ہم نے کہا: ہوٹل ساں میروے کہاں ہے؟ ہماری دہان ریڈویش ہو
 چکی ہے۔ ورنہ ہم ضرور آپ کے ہاں ٹھہرتے۔ آئندہ سہی۔“
 مینجر اور میرا دونوں باختلاق آدمی تھے۔ ورنہ بعض ملکوں میں تو ایسے مسافر
 کو دھکے دے کر باہر نکال دیتے ہیں۔ میرے نے کہا وہ سامنے لگی ہے اس میں
 بائیں ہاتھ کو تیسرا مکان ہوٹل ساں میروے ہے! گڈ بائی سر“
 ہم نے کہا: گڈ بائی! اور پھر سوٹ کیس اٹھا لیا۔

اب یہ ہوٹل کیسا ہے۔ ہم ہوٹلوں کے متعلق لکھتے لکھتے ننگ آگئے ہیں۔
 ہمیشہ یہی لگا کہ ہوٹلوں میں میسر جیوں کے نیچے ڈیوڑھی کے اوپر کسی کوٹنے
 کھدے میں جہاں کوئی گھلایا سا ہوتا ہے اس میں لوگ ایک جھرو بنا کر اُسے
 ہمارے لئے ریڑو کر دیتے ہیں۔ بہر حال ہم اس ہوٹل میں خوش ہیں اور آئندہ
 بھی ہر ہوٹل میں خوش رہیں گے کیونکہ ایسٹرڈم میں مسز ابرز کے ہوٹل میں چھ
 راتیں گزار چکے ہیں۔ اب ہمیں کہیں تکلیف نہیں ہو سکتی۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
 نظم حسرت میں وہ مزانہ رہا

ہوٹل والے نے ہمارا سامان تو رکھ لیا لیکن ابھی گیارہ بجے تھے۔ فرمایا بارہ بجے سے دن شروع ہوتا ہے۔ اس وقت آئے گا۔ فی الحال باہر کی ٹھنڈی ہوا کھیتے گا۔ ہم نے کہاں ہمارا ارادہ بھی فی الحال میرا ہے۔ ہمارا کیا ہے۔ ہمارے سامان کو سر چھپانے کی جگہ چاہیے۔“

ہم نے ابھی ابھی پانچ پونڈ کا فونٹ بنایا تھا۔ ڈسٹ کر ایک پونڈ کا کھانا کھایا اس کے بعد مونچھوں — یا مونچھوں کی جگہ پر تاؤ دیتے ہوئے نقشہ دیکھ کر جھیل کی راہ لی۔

جب ہم آئے ہیں تو موسم ٹھیک تھا۔ لیکن رستوران سے نکلے تو بارش شروع ہوئی تھی اور سردی بھی۔ جھیل کے ساتھ ساتھ ہم تھوڑی دُور تک تو کچھ بھیگتے اور کچھ بچتے گئے لیکن کنٹیاں اور کان سہی ہو گئے۔ موسم ہمارے سامنے کیا چیز ہے۔ موسم کی ہم تھوڑا کئے پروا نہیں کرتے جہاں ہمارے دشمنوں کا بال بیکا ہوا۔ ہم نے ڈاکٹر محمد سرور کو فون کیا لیکن یاد آیا کہ یہ تو کراچی نہیں۔ جنیوا ہے میاں۔ ڈاکٹر آیا بھی تو فیس ملنے لگا اور فیس تم نے منہ مانگی نہ دی تو تمہارا یہ سوٹ کیس اٹھا کر لے جائے گا۔ ٹاپتے رہ جاؤ گے۔ پس چلو واپس ہوٹل۔ بارہ بھی بچ رہے تھے اس وقت تو ہم آگئے اور ٹھٹھہر کرتے سو گئے۔ شام کو پھر نکلے۔ جنیوا کے ارد گرد پہاڑ والی برف پوش چوٹیاں ہم نے ہمارے ہی سے دیکھ لی تھیں اور جھیل بھی صاف ہیں ہمارے اب یہاں اترنے کی حاجت نہ رہی تھی کیونکہ لوگ یہی چیزیں دیکھنے بیل آتے ہیں۔

بازار میں شیشوں کے پیچھے گھڑیوں کے ڈھیر کے ڈھیر نظر آتے ہر شکل و صورت

کی گھڑیاں۔ ہر قیمت کی گھڑیاں۔ سو گھڑیوں کے تاجروں کو تو یہاں ضرور آنا چاہیے
 لیکن باقی لوگ کیوں آتے ہیں یہ ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ ایسٹرڈم میں موسیونان میئر
 نے کہا۔ میں تو ہمیشہ بھری سردیوں میں سوئٹز لینڈ جاتا ہوں اور اپنی چھٹی وانا
 گزارتا ہوں۔ ہم نے کہا سردیوں میں تو وانا سردی ہوتی ہوگی بلکہ برف بھی۔ بوسے
 برف ہی کی خاطر تو جاتا ہوں۔ عجیب لوگ ہیں برف دیکھنے اتنی دور آتے ہیں۔ کیا
 ان لوگوں کے گھروں میں ریفریجریٹر نہیں ہیں۔ ہم نے یہاں کی برف دیکھ لی ہے۔ اب
 سوئٹز لینڈ کی یاد آیا کرے گی تو اپنے فریج کا اوپر کا خانہ کھول کر دیکھ لیا کریں گے۔
 اب رابرٹ پر پھسلنے کا شوق۔ سوہر شوق کی ایک عمر ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب
 ہم بھی جس چیز کو جس صورت کو دیکھتے تھے اس پر پھسل پڑتے تھے۔ اب وہ بات نہیں
 آج ہی شام جینوا کی جھیل کو بھی چل پھر کر بنظر فائر ہم نے دیکھ لیا اس میں ہمیں پانی
 تو نظر آیا اور کوئی خاص بات دکھائی نہ دی۔ سوئٹز لینڈ اور اس کے پہاڑ اور اس
 کی جھیلیں اور ان کی خوبصورتی۔ تاریک کرام۔ یقین کیجئے۔ سب پرائیڈ ہے پرائیڈ۔

کھونا اکاؤنٹ سوسٹر لینڈ میں

اے لوگو! اے وہ تمام لوگو جن سے ہم صمیم قلب سے وعدے کر کے چلے
تھے کہ تمہارے لئے کیمرو لائیں گے، تمہارے لئے کھڑکی لائیں گے۔ تمہارے لئے
ٹیپ ریکارڈ لائیں گے۔ سب کچھ بھول جاؤ اور ولایت کے پتے پر ہمیں خط لکھو
کہ تم نے جہیں معاف کر دیا۔ بخش دیا۔ ہم تم کو مرنے نہیں دکھا سکتے۔

ہم یہ ہے کہ ہم نے تو اپنی طرف سے جزیسی کی بہت کوشش کی لیکن قدرت
ہی کو ہماری خجالت منظور ہے۔ کل کی سیجے۔ ہم نے کمرے میں بند ہو کر بسکٹ
کھا لئے اور پانی پی لیا۔ اور اوپر سے نمک سلیمانی چھانک لیا۔ کیونکہ ویسے یہ خوراک
نقصان کرتی ہے۔ اندر جا کر پھول جاتی ہے۔ شام کو البتہ پیٹ نے کہ بڑا بدکار
ہے کھانا مانگا۔ کھانے کے معاملے میں ہم نے مدت سے ترک حیوانات کر رکھا
ہے۔ بیف یعنی بڑا گوشت ہم سے کھایا نہیں جاتا۔ برلن میں ایک روز بیف
ایٹک سے لیا تھا۔ کھانے اور پچانے کی منزل ہی نہیں آئی۔ ہماری چھری سے کٹا
نمک نہیں۔ ہمارا خیال ہے اصلی بیف نہیں تھا۔ نائیلون وغیرہ کا بنا ہوا تھا۔ خیر

ہم نے چوم کر چھوڑ دیا۔ اسرارِ دھرا دھر سے آلو کھائے۔ لندن میں ہم لمب یعنی
 بھیر کے بچے کا گوشت رغبت سے کھاتے تھے۔ حلال حرام کی بحث انہار میں
 چھڑی تو اس سے بھی گنتے۔ معری کے متعلق ہم نے اور علامہ اقبال نے سنا تھا۔ کہ
 گوشت نہ کھاتا تھا۔ پھل پھول پر گزراوقات کرتا تھا۔ ایک روز کسی نے اسے بھونا
 ہوا تیتتر بھیجا تو بجائے اس کے کہ چپکے سے کھا لیتا، فلسفہ چھانٹنا شروع کر دیا کہ
 جرم ضعیفی کی سزا مرگ مغایات ہے۔ ہمارے معری بننے کی راہ میں کئی چیزیں
 سائل رہیں۔ پھل پھول بھی یہاں کچھ سستے نہیں ہیں اور کوئی شخص نعمت سے
 ہمیں بھونا ہوا تیتتر بھیجے تو ہم سے انکار نہیں ہو سکتا۔ انکار کیا معنی نہیں ہم
 کوئی چیز کھاتے ہیں تو وہ تیتتر کا ہم نسل مرغ ہی ہے۔ بھنا ہوا مرغ بلکہ بھنے
 ہوئے مرغ کی ایک ٹانگ۔ سو کبھی یہ پانچ روپے کی آتی ہے کبھی سات روپے
 کی۔ بون میں ہرنی کے ڈپارٹمنٹل اسٹور سے تو ایک بار ڈھائی مارک کی بھی مل گئی
 تھی، لیکن پھر اس کا مرغ بالا ہی ہوتا گیا۔ جینیوا آکر پہلے روز ہم نے ساڑھے
 پانچ فرانک یعنی ساڑھے پانچ روپے کی لی۔ دوسرے روز ایک جگہ ساڑھے
 چھ کی ملی۔

لیکن ذکر ہم کل کا کر رہے تھے کہ شام کو پیٹ نے ہمیں مجبور کیا کہ کھول
 بٹا۔ کھلا ہیں کھانا۔ ہم نے پچکارا کہ میاں ٹھہر۔ کوئی ہوٹل دیکھتے ہیں جس میں عام
 قسم کے آدمی بیٹھے ہوں۔ کیا کھانے گا؟ سینڈوچ کھلائیں؟ پنیئر کے سینڈوچ بٹے
 اچھے ہوتے ہیں لیکن پیٹ کی وہی رٹ۔ مرغ کی ایک ٹانگ۔

آخر ہم جی کڑا کر کے ایک ریسٹوران میں ٹھس گئے اور کھا کھانا کھائیں گے ہم

بیراہیت موزب اور کاغذ سے کا تھا۔ ایک کمرے میں ہمیں لے گیا۔ اور بولنا کیا پیسے ملے
ہم نے کہا ”کچھ نہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔“
”سوپ کیا لاؤں؟“

ہم نے کہا ”سوپ وہ نہیں چاہیے۔ ہمارے اہل اس کا رواج نہیں۔“
”کوئی آشتیا افزا چیز حاضر کروں۔“

ہم نے پھر کہا ”کچھ نہیں“ ہمارا پہلے ہی بھوک سے دم نکلا جا رہا ہے اور اہل
شکر میں منع ہے۔ لہذا بعد میں میٹھا لٹنے کی بھی کوشش نہ کرنا۔ اہل لانی پیسے گئے۔
”تو پھر کھائیں گے کیا آپ؟“
”مرغ کی ایک ٹانگ۔“

بیرے نے بس ایک چھڑی کا شا ہماری میز پر رہنے دیا باقی سارے اٹھائے۔
تھوڑی دیر بعد آیا۔ ایک چولہا قسم کی چیز لایا جس کے اندر دھواں ہی رہا
تھی۔ زیادہ تکلف کے ہوٹل میں کھانا گرم رکھنے کے لئے اسی قسم کے چوہنے ہوتے
ہیں۔ اب ہمارا تھا ٹھنکا۔

وہ تو اندر گیا۔ ہم نے جوا نکال کر رقم گنی۔ خالصے روپے تھے! اطمینان ہو گیا۔
پہلے وہ پانی کا پیالہ لایا جس میں لمبوں کی تاش پڑی تھی۔
ہم نے اسے ایک طرف کھسکا دیا۔

پھر وہ سلاہ کا پیالہ لایا۔ ہم نے اسے سونگھا۔ شاید زیتون کا تیل یا ایسی ہی
کوئی چیز سلاہ میں تھی۔ ہم نے اسے بھی پرے کھسکا دیا۔

آخر میں وہ جرم ضیفی کی سزا یعنی مرغ کا پارچہ لایا۔ پلیٹ کو چمکے پر رکھا

اس پارپے میں سے آدھا نہایت ادب سے کاٹا اور ہماری پلیٹ میں رکھا۔
 ہم نے کہا 'مرسی' یعنی شکریہ۔ اب جاؤ۔ ہم خود ہی کھائیں گے۔
 کھانا کھایا۔ اور کافی پی۔ بل آیا ساڑھے بارہ فرانک کا۔ اس پر ۱۵ فیصد ٹرس
 چارج بھرا چودہ سے کچھ زیادہ۔ اب کیا پون فرانک ٹپ بھی نہ دیتے۔
 ہم نے بڑی بے اعتنائی سے ہندہ فرانک اس کے حوالے کئے۔ کوٹ بٹھالا
 اور باہر —

لندن میں پھرا چکا تھا۔ مسز وائٹس کے بھیا رخنے میں رہ کر ہم نے کچھ قوتہ بچائے
 تھے جو جرمنی میں خرچ ہوئے۔ جینیوا میں ایک صاحب دمن عزیز کے مل گئے۔ ہماری
 ہی طرح کام کے بدلنے دھپل میں یورپ کی سیر کر رہے تھے۔ کفایت شعاری کی
 خوبوں پر بات چھر گئی۔ ہم نے بھی اسراف کرنے والوں کی جی کھول کر رانی کی اڈ
 کہا۔ دیکھتے لندن میں ہم نے اپنے دھیفے میں سے بچا کر یہ سوٹ خریدا ہے کیا ہے؟
 وہ کچھ متاثر نہ ہوئے۔

اب ہم نے کہا 'یہ اور کوٹ بھی ہم نے اپنی بچت میں سے یا ہے۔ دس
 پونڈ کا آیا تھا۔'

ان پر پھر بھی کچھ خاص اثر نہ ہوا۔ ہم نے ٹائیلوں کی دو قرضیں، جرابوں کے
 جوڑے اور متحدہ ڈائیاں خریدی تھیں۔ وہ بھی دکھائیں کیونکہ ہم اس وقت داد
 طلبی کے موڑ میں تھے۔

اس کا مکمل حقہ رد عمل نہ ہوا تو ہم نے سوٹ کیس کھول کر چینی مٹی کی نیلی پلیٹ

تکلی اور کٹا۔ ڈلفٹ کی ہے، اور یہ دیکھو اس پر پون چکی بھی بنی ہوئی ہے۔“

بڑی شکل سے بولے: ”ہاں ٹھیک ہے۔“

اب ہم نے انہیں پون چکی کا ایک اور نمونہ دکھایا۔ یہ بھی ہم نے لیڈن سے بٹے چاؤ سے خریدا تھا۔ آرٹ کا البم۔ پرانی تصویروں کے کچھ پرنٹ۔ پھلی حدی کے کچھ میگزین اور شاعری کی کچھ کتابیں بھی دکھائیں۔ یہ سب ہم نے انگلستان اور فرانس اور جرمنی سے فراہم کی تھیں۔

بولے: ”کیرہ کونسا یا ہے؟“

ہم نے کہا: ”میں کیرے وغیرہ پسند نہیں، مصوری اور تصویر کشی وغیرہ جاکے شوق نہیں ہیں۔ ماؤزخوں کے لئے ہم نے شاعری سیکھ لی ہے۔ اسی سے کام نکل آتا ہے۔“

”ٹیپ ریکارڈ؟ ٹیلی ویژن؟ ٹرانزسٹر؟“

ہم نے انہیں بتایا کہ گانے بجانے کے آلات بھی ہمارے دائرے سے خارج ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں ہم نے ایک سیکنڈ ہینڈ مرفی ریڈیو یا تھا۔ بڑی خوش اسلوبی سے کام دے رہا ہے۔

اس پر وہ اپنے کمرے میں لے گئے۔ بولے: ”ٹیلی ویژن سیٹ تو میں نے بیک کرا دیا ہے۔ یہ ٹیپ ریکارڈ ہے۔“

”اور یہ کیا ہے؟“ ہم نے کہا

بولے: ”یہ ایکٹرک ٹوسٹر ہے!“

ہم نے کہا: ”ایکٹرک ٹوسٹر کی بات نہیں۔ اس کے پاس جو ہے؟“





بولے: "پریشرنگر ہے۔ کبھی دیکھا نہیں تم نے؟"
 ہم نے کہا: "ان چیزوں کی بجائے تم فریج لے لیتے تو اچھا تھا۔ گرمیوں میں
 کام آتا ہے۔ پانی ٹھنڈا رہتا ہے۔"

بولے: "اں یا ہے وہ کمپنی نے سیدھا بھجوا دیا ہے۔"

"اور کیا کیا ہے؟" اب ہمارا مورال کچھ گرنے لگا تھا۔

بولے: "بس اور کچھ نہیں کیا۔ اں فیٹ کار کے پیسے لندن میں جمع کرادیئے

ہیں۔ اٹلی سے جہاز میں بار ہوگی۔"

ہم نے کہا: "تم نے پوتن چلی کے نمونے نہیں خریدے کیس؟" ہالینڈ کی
 خاص چیز ہے۔"

بولے: "فیس کا کارخانہ بھی تو ہالینڈ ہی میں ہے۔ نیچے جو ڈبہ رکھا ہے اس
 میں فیس کا ٹرانزسٹر ہے۔"

تب ہم نے پوچھا: "کھاتے کیا تھے آپ؟"

بولے: "ڈبل روٹی کھاتا تھا ایک ڈبل روٹی، ایک ڈبہ پیئر کا، مجھ کیسی
 جان کے لئے دو تین دن کو کافی تھا۔"

"رہتے تو ہوٹل میں ہو گئے؟"

بولے: "یہ کمزور الگ لینے کی عیاشی نہیں کرتا تھا۔ لندن کے مصافحات میں ایک
 کمزور بے کرم تین آدمی رہتے تھے۔ اپنی اپنی چارپائی کے پیسے دیتے تھے۔ اب
 یہاں ایسٹروم میں سنکھل کمزور لینا پڑا ہے۔ کمزور تو تمہارے ساتھ آجاؤں۔ آدھا،
 آدھا دونوں دے دیں گے۔"

ہم نے غور کر کے کہا: تمہیں تکلیف ہوگی کیونکہ ہم رات کو خراٹے لیتے ہیں۔ ورنہ انکار نہیں تھا:۔

اب ہم نے غم بالغرم کیا کہ گزشتہ راحلوات۔ اب ہم بھی کفایت کریں گے۔ جینیوا آنے پر ہمیں جو گزارہ ملا اس میں سے ہم نے سو فرانک پہلے ہی ان سوئزرلینڈ کے ایک مشہور بنک میں جمع کرا دیئے۔ اور طے کیا کہ ان کو ہم اب نہیں لکائیں گے۔

سوئزرلینڈ کے بنک دینا بھر میں مشہور ہیں۔ ہزاروں لاکھوں روپے کے کاروبار کرتے ہیں۔ رازداری ان کا اصول ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے حکمران اور سیاستدان اور ملک التجاران بنکوں میں پیسے جمع کرا دیتے ہیں کہ کل کلاں تخت کا تختہ ہوا تو سوئزرلینڈ میں جا رہے ہیں گے یا اس جمع جھٹکے بل پر کہیں در بیٹھ کے عیش کریں گے۔ اور بقیہ عمر یاد خدا میں گزاریں گے۔

ہم نے بھی یہ پیسے جمع کراتے وقت خزانچی سے کہہ دیا کہ میاں اس رقم کا کسی کو قانون کا نپتر نہ چلے۔ ہمارے ملک کا قانون بہت سخت ہے کوئی شخص باہر روپیہ نہیں رکھ سکتا۔

اس نے کہا: اطمینان رکھئے۔ ہم کسی کو نہیں بتاتے۔ آپ کے ملک کے اور بھی بہت سے رؤسا اور سیاست دانوں اور سابق وزیروں کے اکاؤنٹ جا سکتے ہیں۔ بلغئے آسودے کر کے اپنا کیشن سیدھا یہاں جمع کرا دیتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ تم لوگوں کا اصول رازداری ہے اس لئے سب کے نام تو نہیں

پوچھتے۔ چند ایک کے بتا دو۔ ہم اپنے کالم میں تو شاید لکھ دیں۔ ویسے کسی کو نہیں بتائیں گے۔

لیکن وہ شخص تیار نہ ہوا۔ اصل میں ہم بڑی ہوشیاری اور ترکیب سے اس کا امتحان کر رہے تھے۔ کسی کا نام وہ ہمیں بتا دیتا تو اس کا امکان تھا کہ ہمارا بھی کسی کو بتا دیتا۔

اور یوں سوئٹزرلینڈ کے سب سے بڑے اور بااعتماد بینک میں ہمارا اکاؤنٹ کھل گیا۔ ہم نے خفیہ اکاؤنٹ نمبر بھی لے لیا اور حساب کرنا شروع کیا کہ کتنی شرح سود ہے۔ دس سال میں ہماری رقم دوگنی ہو جائے گی۔ یعنی دو سو فرانک اور پچاس سال میں تو یہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔ ہم نے حساب پھیلانا چاہا لیکن ہم سے نہ ہوا۔ آٹا بڑا حساب تو کمپوٹر ہی کر سکتا ہے۔

افسوس کہ یہ پھول دو دن ہمارے جانفزا دکھا کر مر بھا گئے۔ آج صبح ہم نے یہ پیسے نکالوائے۔ بس کچھ ایسی ہی بات تھی۔ ہوٹل کا بل دینا پڑ گیا۔ اس کے علاوہ حتی الوسع اپنے ملک کے قانون کی خلاف ورزی کرنا بھی ہمیں پسند نہیں۔

ہم جنیوا سے چل دیے

اگر ہم جنیوا سے برن نہ آتے، جیسا کہ پروگرام نہیں تھا، ہمارے پاس ہوائی جہاز کا ٹکٹ جنیوا تا زیورخ موجود ہے تو سوئٹزرلینڈ کے متعلق ہماری رائے اسی قسم کی رہتی جیسی متحدہ مداخلت کا اندھری نے ایک نظم میں جنت کے متعلق ظاہر کی ہے کہ :

کیا ہے جنت، چند حوریں، ایک چمن دو ندیاں
ہم نے ایک بار کہا بھی کہ آپ نے محض اس لئے کہ آپ کو وہاں نہیں جانا
برائی کر دی ہے۔ ورنہ ہمارے خیال میں تو اچھی خاصی جگہ ہے جنت، جہیں کوئی
بھیجے گا نہیں ورنہ ہمیں تو کوئی اعتراض نہ ہو۔ فرط نے لگے کیا پتہ میاں۔ وہاں
جانا ہی پڑ جائے۔ آدمی کوئی ہمارا دم تھررتو ہوتا نہیں، کرانا کاتبین اپنے دُعا پور
میں جو جی چاہے لکھ دیں، جو جی چاہے حذف کر دیں۔

جنیوا میں کسی نے مشورہ دیا کہ حضرت! ہوائی جہاز سے سوئٹزرلینڈ نہیں
دیکھا جاتا اور پھر حسنی دیر میں تمہاری بس ہوائی اڈے تک پہنچے گی یا ہوائی اڈے

سے دوسرے شہر کے ٹرمینل تک پہنچاتے گی۔ اتنی دیر میں تم سوئٹزرلینڈ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاؤ گے۔ اور پھر برن نہ دیکھا تو کچھ بھی نہ دیکھا، ہم نے کہا ابھی بات ہے۔

ہم نے ہوٹل ساں ساں ساں کو خیر باد کہی اور پون بجے کی ایکسپریس پر آئی سوار ہوئے۔ شہر سے نکلنے ہی منظر بدل گیا۔ واسے اتھ جھیل کبھی چھپ جاتی تھی، کبھی دکھائی دے جاتی تھی۔ بائیں طرف چراگا ہوں اور سبزہ زاروں کے سلسلے شروع ہو گئے اور ان میں فاصلے فاصلے سے خوبصورت جھوٹے چھوٹے پرانی وشن کے کاریج۔ پھر لوزان آیا۔ یہ بھی خوبصورت شہر ہے لیکن ہمیں تو گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کچھ چاہ نہیں اس کا وہ چہرہ جو ہماری طرف کو تھا بس یورپ کے دوسرے شہروں کی طرح تھا۔ ماؤرن عمارتیں، اشتہاروں کی ریل پیل، ٹریفک کا شور۔ لیکن ان سے گزرے تو وہی سرسبز و شادابی، کبھی گھائی، کبھی واوی، کبھی جنگل، مغرب میں گھائی کی دیوار ہے تو مشرق میں نیشب کا سلسلہ دور جھیں کے پانیوں تک چلا گیا ہے اور اس درمیان میں گاؤں ہیں کھیت ہیں۔ مویشیوں کے ریوڑ ہیں۔ موسم کچھ گدلا سا تھا لیکن کھل دھوپ ہوتی تو منظر کی شادابی شاید ایسی نہ رہتی۔ خدا جلنے کوں لوگ ہوں گے جو ان سبزہ زاروں میں رہتے ہوں گے اور پھر ہمیں صحراؤں کا خیال آیا۔ عرب کے صحرا کا۔ افریقہ کے صحرا کا۔ اپنے صحرا کا جہاں آدمی پانی کے قطرے اور گھاس کی پتی کو ترستا ہے اور وہ جھیں اسی دنیا میں واقع ہیں اور وہ لوگ انہی صحراؤں میں زندگی کے کڑے کو سٹے کرتے سوئٹزرلینڈ دیکھے بغیر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہاں کی گائیں اور دوسرے

موشی بھی موٹے سنڈے نظر آئے۔ ہمارے موشیوں کی طرح بھوکے ننگے نہیں۔

اب ہمارا خیال جھٹکتا ہوا گودان کی طرف گیا۔ پریم چند کی طرف گیا۔ پریم چند کی جنم بھوم کی طرف گیا۔ جہاں کال کے بادل ایک بار پھر منڈلا رہے ہیں۔ ہم جھر جھری سے کرایک بار پھر سوئزر لینڈ میں آگئے۔ اے آنکھو! یہ سب دیکھ لو۔ جانے پھر کب آنا ہو۔ کبھی آنا ہو کہ نہ ہو۔ پھر سحر ہونہ ہو کسے معلوم؟ اور جب ہماری آنکھیں اس حسن اور سزے کے نظارے سے باب بھر گئیں اور چھلک گئیں تو اپنے دوست محبوب خزاں کا مصرع بار بار زبان پر آیا۔ اتنا حسن کیا کر دے؟ اتنا حسن کیا کر دے؟

برن سے پہلے گاڑی کچھ دیر کو قرانی برگ کے اسٹیشن پر کی۔ عین لائین کنارے ایک قبرستان تھا۔ دُور دُور تک قبروں اور صلیبوں کا سلسلہ لیکن سب پھولوں سے ڈھنسی ہوئی۔ سبزہ نورستہ ان ابدی آرام گاہوں کی نگہبانی کرتا ہوا۔ قلم کی کیا مجال جو اس حسن کے سحر صفا کو احاطے میں لائے۔

برن میں ہوٹل میٹروپول پہنچ کر ہم نے کونٹر پر کہا ”جلدی سے ہمیں کمرہ دیجئے“ پھر ہمیں میسر کو نکھنا ہے۔

کونٹر پر ایک لڑکی تھی۔ بولی: آپ مسٹر سنگا ہیں؟

ہم نے کہا ”نہیں۔ ہم مسٹر سنگا نہیں ہیں میسر انا ہیں“ جنیوا سے انٹرنیشنل بیورو آف ایجوکیشن نے فون کر کے ہمارے لئے کمرہ ریزرو کر دیا تھا جس اب دیر مت کرو۔

”مٹر سوتے نے فون کیا تھا۔“

ہم نے کہا: ”مٹر سوتے کو ہم نہیں جانتے نہ مٹر جاگتے کو جانتے ہیں۔ وہاں تو بس کا روڈیل تھیں۔ ہو سکتا ہے ان کے دفتر میں مٹر سوتے کوئی صاحب ہوں؟“
 بولیں: ”اگر آپ مٹر سنگا میں اور مٹر سوتے کے فرسادہ ہیں تو چشم ماروشن دل ماننا۔ مکرو حاضر ہے۔“

”ورنہ —!“

”ورنہ نہیں۔ ہمارے پاس ایک ہی سنگل مکرو ہے۔“

پہلے تو جی میں آئی کہ دیں کہ وہاں ہمیں مٹر سنگا میں۔ سنگا ہماری عزیت ہے لیکن سچ سچ کے مٹر سنگا آگئے تو ناحق فضا تہ ہوگا۔ ہم نے کہا۔ ہم نہیں جانتے آپ جیو فون کیجئے۔ یہ نمبر ہے ان سے تصدیق کیجئے۔ جنہوں نے مکرو ریزرو کر دیا تھا۔ انہوں نے فون کیا اور فون کرتی رہیں۔ پہلے نہ جلتے کون فون پر آیا پھر کوئی آؤ آیا۔ پھر کسی اور کو بھیجا۔ آخر کھلا کہ وہ لوگ ہماری ریزرویشن کرانے کا ارادہ تو رکھتے تھے لیکن بس بھول گئے۔

ہم نے کہا: ”خیر! بندہ بشر ہے۔ لیکن ہمیں مکرو چاہیے۔“

بولیں: ”ڈبل روم ہے۔ سنگل تو ہے نہیں؟“

ہم نے کہا، ٹھیک ہے۔ ڈبل روم ہی دیکھئے۔ ہوٹل ایسا پر رعب اور شان شوکت والا ہے کہ ہم نے بھاؤ تاؤ نہیں کیا۔ آج کی رات تو سوئیں گے۔ فرے کریں گے۔ کل بل دیتے وقت دیکھا جائے گا۔ اصل میں ہم البرز ہوٹل اور ماں ماں ماں ہوٹل قسم کے ٹھکانوں میں رہتے تنگ آگئے ہیں۔ اب یہ اتنا کشادہ مکرو ہے جس میں

ہم پلنگ پر آلتی پالتی مارے بیٹھے مکھڑے ہیں۔ ہوٹل ساں ساں میں تو رات کو جونی دامن خیال یار کو کپڑے کے لئے کروٹ بدلی، زمین پر آ رہے۔ ہم نے خود ہی بیروہ واہوں سے کہا تھا کہ اب کے ہمارے لئے کوئی فٹ کلاس ہوٹل مقرر کیجئے گا:

ہوئے: "میٹرڈپول اچھا ہے لیکن مہنگا ہے۔"
ہم نے کہا: "آپ کیا سمجھتے ہیں۔ ہم کھلتے پتے آدمی ہیں۔ لہذا ہمارے سٹیشن کا خیال کرو۔"

فرمایا تو ہٹن وغیرہ میں آپ کے لئے کمرہ مع غسل خانہ ریزرو کرا دیں:
اب ہم کچھ ڈر گئے۔ ہم نے کہا: ہٹن وغیرہ سے ہمیں وحشت ہوتی ہے شور بہت رہتا ہے اور غسل خانہ کی حاجت نہیں۔ آج کل سردیاں ہیں ہمیں حکیم نے نہانے سے منع کر رکھا ہے اور فٹ کلاس کا مطلب ہے ہمارے حساب سے فٹ کلاس۔

اس پر ان لوگوں نے میٹرڈپول کر دیا۔ یعنی کرنے کا وعدہ کیا۔ ہم نے سوچا تھا کہ سنکل روم ہوگا۔ آخر کہاں تک مہنگا ہوگا۔ ڈبل روم کی ہم نے سوچی ہی نہ تھی۔ لیکن ہمارے ساتھ پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔ اسے موقع پر ہم آدھی رات تک ایک بستر پر سوتے ہیں۔ باقی رات دوسرے پر لوٹ لگتے ہیں۔ ناشتہ غالباً ایک ہی طے گا۔ کم ہوا تو اپنے خیر حاضر پارٹنر کا بھی منگا کر کھائیں گے۔ کیوں کہ ہوٹل ساں ساں واہوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ بس ایک چھوٹی سی پاپا تماردنی ٹیٹے تھے۔ مکھن بھی بقدر اٹک ببل، ذرا سا مار میڈ۔ اب ہمیں مسر دامن یاد آئیں کہ دو انڈے دیتی تھیں۔ بے شمار تو سوں اور مکھن مربے کے علاوہ کارنی فلیک اور

دودھ بھی۔ پھلوں کے رس کا گلاس بھی روہاں سے گرتے تو جرمی میں باقی ٹھیک ہے
 ان ائمہ اپنے پتے سے کھایا۔ ایسٹرڈم میں ممکن اور نیراوتہا قسٹم کی میٹھی پھمکی
 مسے دارو ٹیوں کا ڈھیر جنیرا میں تو کئی بار ہی چاہا کہ ساتھ ولے کی پلیٹ سے
 نظر بچا کر روٹی اٹھالیں۔

کسی شہر سے رخصت کی شب ہمیشہ ہم پر بڑا اثر چھوڑتی ہے۔ ایسٹرڈم
 سے ہمیں علی الصباح چلنا تھا اور چھ بجے اٹھنا تھا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی پانچ
 بجے سامنے سڑک پر گھنے کی آواز آئی۔ تین لڑکے اور دو لڑکیاں پھرتاں تانے
 ایک مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھی الپ کر رہی تھیں I LOVE TO KISS YOU
 آواز میں اُبتی ہوئی جوانی اور بے نگرہی۔ جلنے کون لوگ ہوں گے کہاں
 کے ہوں گے۔ پھر وہ ناپ چنے لگے۔ ہم نے اپنا دریچہ کھولا۔ مدھم روشنی کی تو وہ
 لوگ متوجہ ہوئے۔ اے مسافر کہاں کے رہنے والو ہو تم۔ ہم نے جی میں تو کہا کہ تم
 جہاں کے ہو وہاں کے ہم بھی ہیں۔ لیکن یوں خاموش رہے۔ اب وہ بوسے کو فسی
 زبان بولتے ہو۔ اب پھر ہم نے اپنے آپ سے کہا کہ دل کی زبان بولتے ہیں۔ اور
 بھتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ تم سے آن ملیں۔ کیوں نہیں تم لوگ یہاں آجالتے اس
 گرم بستر میں آرام کرتے اس بے خانقانی سے چھٹکارا پاتے۔ کوئی جواب نہ پا کر ان
 لوگوں سے اپنی حدی کو تیز تیز اور اپنی نوا کو بلند تر کر دیا۔ دل کو کئی کہانیاں یاد سی
 آکے رہ گئیں۔ اے بقیہ رومو! ہم تمہارے ہیں، تمہارے ساتھ ہیں۔ اب ہم
 نے دریچہ بند کر لیا مگرے کا بھی، دل کا بھی، آنکھوں کا بھی، جلنے کب وہ لوگ برستے

پانی میں کہاں رخصت ہو گئے۔ دوبارہ آنکھ کھولی تو سنا تھا۔

جنیوا کی آخری رات ہم نے دریا پار سنہری کلسوں والے روسی گرجے کا چکر کاٹ کر یونیورسٹی کے باغ میں سے ہوتے ہوئے نئے چوک سے پر وی نیڈ ڈی لا ترلی کی سیرگاہ میں ٹھیک لی۔ گھائی چڑھ کر ان ٹیڑھی میڑھی تنگ و نیم تاریک جگہوں میں گم ہو گئے۔ جن میں اب بھی سولہویں اور سترھویں صدی کی بوباس تھی۔ سب سے پہلے کوچہ تیرسے آیا۔ وہ حویلی جس میں ۱۸۰۰ میں نپولین اعظم مادام سالیوں کے ہاں محان اتر تھا۔ یہ چند گز کا کوچہ آگے ایک اور ایسے ہی تنگ کوچہ میں مل گیا۔ دہنے ہاتھ چڑھائی تھی اور یہی گرانڈ رو تھی۔ ۲۵ کے مکان کے سامنے جا کر ہم رک گئے یہاں ملٹن اٹلی سے واپسی پر پاپسیچور دیو دارتی سے آگے طاق تھا۔ اور آگے تھوڑی دُور چل کر دہنے ہاتھ کا یہ اونچا مکان دیکھئے۔ نمبر ۲۰ یہاں ۱۷۷۲ء میں روسی پیدا ہوا تھا۔ اب لڑیے اور نشیب کی طرف آئے جہاں گرانڈ رو ختم ہوتی ہے۔ رودی لا سیتے شروع ہوتی ہے۔ نمبر ۲۰ پر یہ اونچی حویلی دیکھ رہے ہیں آپ؟ کبھی یہ شاقو بریاں کی قیام گاہ تھی! اچھالے رفقہاں کی روح۔ اس ماسٹر کا سلام لیکن جاتے ہوئے ایک نظر اور دلی پطرس کے کیتھڈرل پر، اس کی پہلی اینٹ ۱۱۵۰ء میں رکھی گئی تھی۔ عمارتیں کھڑی ہیں۔ ان جگہوں میں پیدا ہونے والے جوان ہونے والے۔ گھومنے والے ہی نہیں رہے، ہر چیز کو دوام ہے سوائے انسان کے۔ درو دیوار موجود ان کے بنائے والے مٹی ہو چکے۔ اب چل اے سیلانی دریا پار کر اور کل کے لئے رخت سفر درست کر۔



برن کی جگن ۲۷

برن کی سحر بھری رات

ہم نے پریس کے گرجوں اور اسٹینبول کی مسجدوں کو تحیر سے دیکھا ہے تو ٹری
 ڈیم۔ کو لون کا کلیسا۔ آیا صوفیہ کا گنبد۔ مسجد سلطان فاتحؒ نے دکھایا تو اور بہت
 کچھ دیکھنا باقی ہے لیکن قرون وسطیٰ کے جس آپسی اور الف ایلیوی ماحول میں آج
 برن کی گلیوں میں اس تنہا نے گشت کی ہے۔ اس کا بیان محال ہے۔ آج بہت
 دن بعد چاند نظر آیا نہ جانے کس تاریخ کا ہے۔ برن کے بازاروں کے پرانے
 محرابی راستوں میں جلنے کہاں سے چلے کہاں جانیکے۔ کھاک ناود سے آگے گزر
 کر سڑک کا نام پڑھا۔ اچھا تو یہ کرام گاسے ہے۔ یہاں مارکیٹ گاسے کی سی چل
 پہل نہیں ہے۔ شب اترنے لگی ہے۔ لوگ رخصت ہونے لگے ہیں۔ کاریں
 موٹریں بھی اکا دکا گزر رہی ہیں یہ بھی پکی اینٹوں کا راستہ ہے۔ عین سڑک بیچ وارس
 کا مینار آگیا جس پر کوئی پکیر بھی بنا ہوا ہے اب سڑک کی اتراقی شروع ہو گئی ہے۔
 دیکھتے کہاں تک جاتی ہے۔ دور وہ مجرایں ہی مجرایں۔ دونوں طرف چیزیں بیچنے
 والوں کی دکانیں کہیں کوئی چلتے خانا بھی ہے یا بیر کا پیسہ پڑا ہے۔ برآمدہ اونچا

ہے تو سڑک پر اترنے کے لئے میڑھیاں بنا دی ہیں اور نیچے۔ اور نیچے، لیجئے پل
 کا خاکہ نظر آنے لگا۔ افوہ! نیچے دیا ہے۔ دریا کے ساتھ سڑک ہے۔ چھ چھ سات
 سات منزل کے مکان ہیں جن کی چھتیں پھر بھی پل کے برابر نہیں پہنچتیں۔ اس اونچائی
 سے کاریں اور چلتے پھرتے لوگ بھی چھوٹے محسوس ہوتے ہیں۔ اب پل کا سرا آگیا
 ٹوٹنا چاہیے۔ واپس کراہ گاسے۔ لیکن نہیں۔ یہ بایں ہاتھ کی دیران گلی دل کو کھینچ
 رہی ہے۔ جنگرن گاسے۔ یہاں تو قدامت کی چھاپ کچھ اور گہری ہے۔ موٹے آثار
 کی چوڑی اور نیچی گول محرابیں۔ وہی کہ اصفہان کے مسقف بازار میں ملتی ہیں لیکن
 ان کی نسبت پست۔ تین صدی پہلے کی تو ہوں گی۔ سناٹا۔ کسی پُر اسرار فلم کا سا سین
 ہے۔ روشنی بھی کم کم۔ کہیں کہیں کوئی دوکان کھلی بھی ہے لیکن گاہکوں کے لئے نہیں
 دکاندار بیٹھا دن بھر کی کمائی کا حساب جوڑ رہا ہے۔ بیسوں کے سائے عجیب شکلیں
 بنا رہے ہیں۔ لیجئے کھلا احاطہ آگیا اور پندرہویں صدی کے مشہور گرجا نائیدگ
 کرک کی پشت۔

میاں سے ایک تنگ میڑھیوں کا سلسلہ نیچے کہیں اتر گیا تھا ان نیم تاریک
 میڑھیوں میں بے سمجھے آ رہا ہے خطرناک جلتے کہاں پہنچا دیں لیکن دیکھا جائے۔
 ۵۔ میڑھیاں، پھر موڑ، پھر ۴۰ میڑھیاں، پھر موڑ۔ اگلے موڑ کے مجھے سے
 قدموں کی چاپ آرہی ہے۔ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ ہم جیسا خدائی خوار، لگا گھونٹنے
 والا۔ نہیں یہ تو کوئی طالب علم سا لگتا ہے بعل میں کتابیں ہیں۔ نیچے کتاب دریا
 کی آبادی سے آ رہا ہوگا۔ اٹھا موڑ۔ لیکن یہ تو لا قتنا ہی سلسلہ ہے اب واپس اب
 قدموں کی چاپ اوپر سے آئی شروع ہو گئی۔ نیچے کے راستے میں اب کوئی نہیں

ہے کیونکہ صدیوں پرانی ان بوسیدہ میٹریسوں پر تھوڑی سی آہٹ بھی بہت گونجتی ہے۔ ہم اس رستے کے ادھر میں ہوں گے۔ اب اوپر کی چاب قریب آ رہی ہے۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔ ارے یہ تو کوئی لڑکی ہے۔ ارے لڑکی تو اس دیرانی اور نلٹے میں کہاں سے آگئی کیا تجھے کسی کا ڈر نہیں؟ نیچے کنارہ دریا پر کس کی کشش تجھے لے جا رہی ہے۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔ خوشبو کا ایک جھونکا پاس سے گزر بھی گیا۔ اوپر گر جا کا احاطہ۔ احاطے میں پھولوں اور پودوں کی روش کوئوں پر شش پہلو سرخ محافطوں کی کوٹھڑیاں، دور احاطے کی دیوار، اس کے ساتھ دوسلے دور باش لے اجنبی ان کے ذہن میں جھنگ نہ ڈالنی چاہیے۔ اب ذرا دیوار کی منڈیر پر جھک کر نیچے دیکھو۔ بار خدایا۔ کیا منظر ہے، دریا راتے ملکان، دیر بچے، دیر بچوں میں روشنی، روشنی میں لوگ۔ اچھے لوگ، بُرے لوگ، شاد لوگ، ناشاد لوگ اپنے آپ میں گم، دوسرے انسانوں کے غموں اور خوشیوں سے بے پروا۔

اور لے کر جا۔ تو جو پانچ سو سال سے سر ہلکا کھڑا ہے۔ تو نے کس کس کمزنگی دیکھا ہے یہ تیرے ماتھے پر غیموں کا جال کیسا ہے! ادھر بچتے جانے والوں کے پکڑیوں کا، جرم ہے۔ ادھر مقہورین اور مغضوبین کا۔ انوہ گیارہ بچ گئے کیا؟ پہلے سرٹلی گھنٹوں کا سلسلہ، پھر گھن گرج، اچھا رخصت۔ لوگ آئیں گے دیکھیں گے چلے جائیں گے۔ تو یونہی پانگل کھڑا گجر بجا رہا ہے گا۔ لے غفلت استادہ ہم فانی ہی سہی لیکن تجھ سے مجبور نہیں۔ دُور دور کی منزلوں میں قدم ماریں گے۔ اور

وہاں جا آرام کریں گے۔ جہاں سب آرام کرتے ہیں۔ ہم تیرے شکوہ اور سر بلند کا پر
 تحیر ضرور کریں گے۔ لیکن رشک نہیں؛ پانچ سو برس تک کوچہ جلکھن گاسے کی
 اداس محرابوں والی گلی اور دریا کے درمیان بے حس و حرکت کھڑے رہنا ہمیں
 منظور نہیں۔ ہرگز منظور نہیں۔

زیورخ تک براستہ ٹھنڈہ

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جہاں ہم جس ہوٹل میں ٹھہریں اس پاس مرمت کا کام بہت نکل آتا ہے۔ جنیوا واسے ہوٹل کے سامنے سڑک براستے مرمت بند ہے۔ کابورڈ لگا ہوا تھا۔ اور دن بھر جنیوا کے کسے ڈی اے واسے خاک اڑاتے رہتے تھے۔ برن میں ہماری آمد کی اطلاع پاتے ہی ان لوگوں نے ایک بہت اونچی سی گرین ہماری کھڑکی کے سامنے لاکھڑی کی اور شب بھر گڑگڑا دھڑدھڑ ہوتی رہی۔ ایسٹریڈم کے ہوٹل کے ساتھ ہی ان دنوں ایک شخص کو اپنا پرانا مکان ڈھکا کر نیا بنانے کی سوچھی تھی۔ ایک آدھ جگہ کی تو خیر تھی لیکن ہر جگہ ہر شہر میں اس کا التزام محض اتفاق کہہ کر نہیں مانا جاسکتا۔ مرمت کے ذل پر یاد آیا کہ کام تو رونکا ہمارے دل میں بھی بہت ہے لیکن کاریگر اس کے پاکستان میں ہیں۔

برن میں دوسری صبح ہر طرف دھند ہی دھند تھی لیکن ہمارے پاؤں میں چکر۔ نو بجے چل نکلے سب طرف سڑکوں اور موٹر وں کی بتیاں جل رہی تھیں۔



زوریخ — دریائے زوریخ کا ساحل

لکھاؤ کے پاس سے نکل کر چن فیڈ ہل سے دریا پار کیا تو سامنے برجوں والا ایک قلعہ نظر آیا۔ اور اس کے سامنے چوک میں مجسموں کا ایک سلسلہ۔ لیکن ہماری منزل ایک لائبریری تھی۔ لہذا حکومتی اسٹریٹ پکڑی اور ایک دو جگہ بٹک کر اوپر چڑھ کر منزل پر پہنچ گئے۔ یہاں ہمیں کچھ ایسا کام نہ تھا بس دیکھنا تھا۔ ہم نے جاتے ہی تعارف کرایا کر ہم صاحبِ علم آدمی ہیں کئی خطوطے وغیرہ ہوں تو دکھا دو معلوم ہوا کوئی نہیں جرمن زبان کی کتابیں ہیں۔ وہ بھی حوالے کی۔ ہم نے کہا اچھا یہ بات ہے تو سلام علیکم خدا حافظ۔

لیکن لائبریری میں رہے ہمیں یوں مستی چھوڑنے والی نہیں تھیں۔ انھوں نے ہمیں یونین کینڈاگ کی تفصیل بتائی شروع کی۔ پھر ریڈنگ روم دکھایا اور کہا

اس میں بیٹھ کر لوگ پڑھتے ہیں پھر وہ خلتے دکھائے جن میں انڈس کا رڈ رکھے تھے۔ پھر کہا۔ اوپر چلو۔ قطار در قطار کتابوں کی الماریاں بھی دکھاؤں۔ ہم نے کہا ہم نے سب سمجھ لیا۔ بہت اچھی لائبریری ہے! اللہ اس کی عمر ورازا کرے۔

فرمایا۔ میں نے اپنی بات تو ابھی پوری نہیں کی۔ اور پھر انھوں نے اپنی بات پوری کرنی شروع کی۔ یونین کیڈلگ۔ یونین کیڈلگ۔ یونین کیڈلگ۔ گڑی تو ہماری ایک بچے جاتی تھی لیکن اس سے پہلے ہم وہ عجیب گھردلیو لینا چاہتے تھے جو پاس کے چوک میں واقع تھے۔ پھر ہمیں کلاک ٹاور جا کر گھنٹہ بجتے دیکھنا تھا۔ پھر ہمیں وہی کل رات والا پل پار کر کے دیکھوں کا بھٹ دیکھنا تھا اور وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

ہم نے پھر کہا۔ ہم اس لائبریری کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ خدا حافظ۔ فرمایا: آپ نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے آپ کو جو من کے پرانے رسالوں کے خاکی دکھاؤں۔

اوریوں ان کے اصرار اور ہمارے انکار میں ایک میوزیم کا تو وقت نہ رہا دوسرے کے لئے ہمارے پاس کلم سات منٹ بچے۔ خیر ہم لوگ گرد پوش پڑھ کر کتاب پر فاضلانہ دیویو کرنے والے ہیں۔ ان سات منٹ میں برن کے ہسٹری اینڈ آرٹ میوزیم میں رکھی ہوئی چیزوں کی ہسٹری پر عبور حاصل کر کے اور آرٹ کے شاہکاروں کی مین میکھ نکال دیران سے اپنا اودر کوٹھے تھینک یو کہہ باہر آ گئے۔ ایک حوان مجسموں کا بھی کیا۔ اس میوزیم میں ہمارے

نزدیک سب سے طرفہ چیز تو اس کی عمارت ہے۔ یہ وہی برجوں والا قلعہ تھا جسے ہم نے جاتے ہوئے دیکھا تھا تو نہ جانے کیا سمجھا تھا۔ یہ ساری جلدی اس بات کی تھی کہ بارہ بجے کلاک ٹاؤن پہنچ جائیں۔ اس کلاک ٹاؤن میں جب گھنٹہ پورا ہونے کا وقت آتا ہے تو ریچھوں اور ٹھٹھڑوں کی ایک قطار گھومتی ہوئی نکلتی ہے اور ڈیوگ مارٹن کابٹ دونوں ہاتھوں سے گھڑیاں بجاتا ہے۔ یہ طرہ تماشا دیکھنے کو جو نہ جانے کب سے جاری ہے دُور دُور سے لوگ آتے ہیں۔ ہم نے بھی جب تک یہ نہ دیکھ لیا۔ کلیئر ٹھٹھڑا نہ ہوا۔

اب ہم نے پھر کل رات والا راستہ چڑھا۔ کرم لگا ہے اور اس سے آگے پرانا پل اور گرجا اور پھر ریچھوں کا بھٹ۔ ریچھ اس شہر کا نشان ہے۔ بھٹے پر ریچھ، مہر پر ریچھ، ڈو حال پر ریچھ۔ کہتے ہیں ڈیوگ مارٹن نے یہ شہر بنانے کا خیال کیا تو عہد کیا کہ اس کے نواحیات میں شکار میں جو جانور سب سے پہلے ہاتھ لگے اس پر شہر کا نام رکھا جائے گا۔ اور وہ جانور ریچھ تھا۔ پل پار کرنے پر دھننے ہاتھ کو ایک گرا بھٹ لے گا جس میں ریچھ رکھے گئے ہیں۔ بلکہ دو بھٹ ہیں جن کے گرداگرد جنگلی ہیں۔ ایک میں بڑے ریچھ۔ دوسرے میں ان کے بچے یہ ریچھ کے بچے بڑے کلنڈر سے اور معصوم صورت ہیں۔ لوگ ان کو دیکھنے دُور دُور سے آتے ہیں۔ کسی کو اوپر کھڑا دیکھتے ہیں تو پھلے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سلام کرتے ہیں۔ ناچتے ہیں کہ ابھی انعام ملے گا۔ کوئی اوپر سے گاجریں پھینکے گا۔ زیادہ تر تو بے چاروں کی محنت رائیگاں جاتی ہی دیکھی گاجریں تو ہم بھی نہ لائے تھے۔ سو چا پیسے پھینک دیں خود ہی غریب کر کھالیں گے۔ پھر

برن کا کلاک ٹاور



باز ہے کہ وطن پہنچ کر ہم بھی نظیر اکبر آبادی کی طرح ریچھ کا سچا پانے کی کوشش کریں گے۔

برن سے ریل میں بیٹھے تو پھر وہی خوبصورت وادیاں چراگاہیں چھوٹے پھوٹے مکان چرتے ہوئے مویشی، اور جنگل اور پرہت۔ دامن میں گوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو، کی تنا کرنے والا شاعر اقبال ان راستوں سے کئی بار گزرا۔ کیا عجب انھی مرغزاروں اور کساروں نے اس سے یہ نظم لکھوائی ہو۔
ہوا تھکا سا سر نہا سیرے کا ہو بھوننا پانی بھی موج بن کے اٹھا اٹھ کئے لیتا ہو اس خاموشی میں جاہلیں اتنے بلند ناے تاروں کے تانے کو میری صدا دے رہا ہو پرہت، نیلا پرہت، احمد بیٹر، خیال بھٹکتا ہوا کہاں کہاں جا نکلا۔

سامنے کی سیٹ پر ایک بڑے میاں بیٹھے تھے پہلے انھوں نے ہم سے جرم میں گفتگو شروع کی۔ جواب باصواب نہ ملا تو فریج پر آئے۔ ہم نے یہ وار بھی خالی دیا تو شاید اٹالین شروع کی آخر ہم نے اردو میں کہا میاں بایہ فرنگی بولیاں ہیں نہ آویں۔

گفتگو ریختے ہیں ہم سے کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

آخر وہ ایک دوسرے بڑھے سے گفتگو میں جٹ گئے جو ان کی بات کا جواب دے کر سو جاتے اور ایک خراٹا لے کر پھر اٹھ جاتے۔ باتیں وہ اس ہمارے سامنے والے بڑھے سے کرتے تھے۔ دیکھتے تھے رہتے تھے۔ ہم اور

تو کیا بولتے۔ ہونکارا بھڑا شروع کر دیا۔ یا۔ یا۔ یعنی ناں، ناں، بجا
 فرمایا۔ بجا فرمایا۔

اب اولٹن آگیا۔ یہ ایک جنگلش ہے برن اور زیورخ کے درمیان۔ یہاں
 ہم نے اتر، سامان امانت رکھوا، اپنی منزل کا پتہ پوچھنا شروع کیا۔ سارے
 پیسٹ فارم پر ایک بھی شخص انگریزی سمجھنے والا نہ ملا۔ اس پر ان لوگوں کو دھڑی
 مہذب ہونے کا ہے۔ کوٹ پتلون پہنے پھرتے ہیں۔ آخر معلومات کے دفتر
 میں گئے۔ پتہ چلا یہ ٹل پار ہی ہماری منزل ہے۔ اس کے باوجود ہم تھوڑی دیر
 تک بٹھکتے پھرے، کچھ دانستہ کچھ نادانستہ۔

برن سے چلتے ہیں ہم نے ایک جگہ کافی پی تھی اور ساتھ میٹھے بسکٹ کھا
 لئے تھے۔ گاڑی ہماری پونے تین بجے پہنچی۔ ہم نے سوچا جن صاحب سے ملنے
 جا رہے ہیں وہ اس وقت تو خیر کافی چلائیں گے، اس کے ساتھ ہی بسکٹ ایک
 وغیرہ۔ پھر ہم گفتگو کریں گے، تو بے تکلفی بڑھے گی۔ پھر وہ کہیں گے۔ غرض
 کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات

ہم کہیں گے۔ نہیں نہیں۔ کیا تکلف ہے، ہم زیورخ پہنچ کر کھائیں گے
 وہ کہیں گے۔ واہ! ہم کھانا کھائے بغیر جانے نہ دیں گے۔ بلکہ ہمارا تھکلا اٹھا کر چھاپیں
 گے۔ آخر ہم ہتھیار ڈال دیں گے۔ کمانی والے بہرے کی طرح ہم یہ مکمل سوچتے
 ان کے در دولت پر پہنچے۔ ان کی سیکرٹری نے کہا، وہ معروف ہیں۔ ہم کچھ خفیہ
 سے ہو کر بیٹھ گئے، اور کتابیں دیکھنے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد ان کی سیکرٹری پھر

آہن اور بولیں، نیچے کی منزل میں کچھ کتابیں اور رکھی ہیں، وہ بھی چل کر دیکھ لیجئے کیونکہ مسٹر فلاں ابھی تک مصروف ہیں۔ ایک صاحب سے گفتگو کر رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ سے ملیں گے۔

آخر مسٹر فلاں ملے۔ بڑی اچھی طبیعت کے آدمی ہیں۔ انہیں کچھ معلومات درکار تھیں جو ہم مہیا کرتے رہے۔ پھر ہم نے کچھ پوچھا۔ انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے جواب دیا۔ ہمارے پیٹ کی کھد بہ ہمیں نڈھال کئے دے رہی تھی لیکن اس اٹھ کے بندے نے ہم سے اسکول ہی کی بات کی۔ یہ نہ بتایا کہاں رکھی ہے ردنی رات کی۔

یہ رنگ ڈھنگ دیکھتے تو ہم نے پونے پانچ ہی بجے اجازت چاہی۔ انہوں نے کہا۔ اچھا تو آپ جانتے گے۔ یہ کہہ کر دروازے تک چھوڑنے آئے۔ گاڑی ہماری سواچھ بجے چلتی تھی لیکن ہم ڈگ بھرتے اسٹیشن پہنچے۔ باہر ایک مڑگ پھل والا کھڑا تھا۔ اس سے مڑگ پھل لی اور اندر جا کر پوچھا۔ کوئی گاڑی ہے زیورٹ جانے والی اس وقت۔

جواب ملا۔ سیدھی گاڑی سواچھ بجے جائے گی۔

ہم نے کہا: سیدھی الٹی سے مطلب نہیں۔ ہم فوراً جانے والی گاڑی مانگتا؟ ٹکٹ بایونے کہا: ہاں پانچ بج کر تین منٹ پر ایک گاڑی جاتی ہے لیکن منہر ہے۔ بڑا چکر کاٹ کر برگ کے رستے جائے گی۔ اور قریب قریب اس وقت پہنچے گی۔ جب سواچھ والی ایکسپریس ٹرین۔

ہم نے سامان یا اور پلیٹ فارم ٹک کی طرف ایک جست کی۔ گاڑی نے بھی

ہمیں روکنے کی بہت کوشش کی کہ یہ پنجر ہے اس میں مت بیٹھو لیکن ہم نے مان کر نہ دیا اور کہا یہ راز یورخ کا ٹمٹ۔ اگر اور پیسے بنتے ہیں تو بولو۔ لیکن اولٹن اسٹیشن پر بیٹھ کر انتظار کرنے کی بجائے چلتی گاڑی میں بیٹھے رہنا چاہا۔ اور یوں ہم نے براستہ جھنڈہ جانے والی پنجر ٹرین میں مزاحم پہلی ٹھونگتے سفر کیا۔

جو لوگ دیہات یا چھوٹے قصبوں میں بڑھے پئے نہیں وہ براجم لائٹوں اور پنجر گاڑیوں کا لطف کیا جانیں۔

یہ گاڑی بھی ذرا سا چلتی تھی اور رُک جاتی تھی جیسے جھوٹے کی بیماری ہو۔ مسافر آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے۔ پہلے اسٹیشن سے بچے سوار ہوئے دوسرے سے دیہاتوں کا ایک غول میٹوں پر پھسکڑے مار کر بیٹھ گیا اور گاجریں کھانے لگے۔ اب ہمیں اپنی گاڑیاں یاد آئیں۔ متحدہ باندھے ہوئے بڑھے ان کے بچے اور گھڑیاں۔ کسی میں گڑ، کسی میں چاول، کسی میں تبا کو کسی نے نئی ہنڈیا یا ایو منیم کی پرات خریدی ہے۔ کسی کے پاس نئی چنگیر ہے۔ تو لے میں نلک کے ڈبے بندھے ہیں۔ قصبے میں خریداری کرنے آتے تھے جنی عورتوں سے میٹوں پر بیٹھا نہیں گیا۔ وہ فرش پر یا کسی ٹرنک پر بیٹھے گئیں اور بچنے دانے نکال کر کھانے شروع کئے۔ اب گاڑی کھڑی ہے اور کھڑی ہے کیونکہ کسی اور لاڈلی گاڑی کو پہلے گزنا ہے۔ ایک بڑے میاں نے فرش کے کونے کھدروں سے کاغذ اور تنکے جمع کئے۔ اور فرش پر آگ جلا کر حقہ بھرا۔ کوئی ہمت والا دوڑ کر گیا اور پاس کے کھیت



سے گئے اکھاڑ لایا۔ اور اب گاڑی کے اندر ہی چھلوں کا ڈھیر لگ گیا ہے۔ ابھی ان کی منزل دُور ہے۔ کوئی اگلے سٹیشن پر اتر جائے گا۔ کوئی اسٹیشن پر پھر کوئی بہت طرہ باز خاں ہوا تو ٹائٹل ڈھونڈے گا ورنہ سامان کی گٹھریاں ٹرنک دینگے سر پر رکھے، بقیایا بندوقوں میں داب شام کے چھپٹے میں کیتوں کی گڈنڈیوں میں گاؤں کی راہ لیں گے۔

پھر گاڑی کھڑی ہو گئی اور ہمارے قصد کی آٹھ کھل گئی۔ ہمیں تو یہاں کے دیہاتی اسٹیشنوں پر بس ایک ہی آدمی نظر آیا۔ اسی نے جھاگ کر کاٹا بدلا۔ اُسی نے جھنڈی دی۔ اسی نے لوگوں سے ٹکٹ وصول کئے۔ غالباً اسٹیشن ماسٹر ہوگا۔

ہمارے ان بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی عادت عام ہے۔ ہم نے بھی بچپن میں کئی بار کیا ہے۔ یہاں کے لوگ بلا ٹکٹ سفر نہیں کرتے اس کی ایک وجہ تو ان کی طبعی ایمانداری ہے۔ دوسری شاید یہ ہو کہ چلینگ بڑی سخت ہے۔ اسٹیشن چھوٹا ہو یا بڑا ہو چکر ضرور آئے گا۔ اور ٹکٹ میں سو راز کرے گا۔ زیورخ کے قریب پہنچتے پہنچتے پندرہ جگہ ٹکٹ کر ہمارے ٹکٹ کا یہ حال ہوا تھا کہ پڑھا نہ جاتا تھا کہاں کہاں ہے اور ٹکٹ ہی ہے یا کچھ اور۔ زیورخ سے دو اسٹیشن اور صریح آخری بار کٹا اور ختم ہو گیا۔ اگلے اسٹیشن پر ہم نے چکر سے کہا کہ وہ جس پر آپ اپنی مشق ناکرتے تھے وہ تو نہیں رہا۔ اب میری انگلی اس آسے سے کاٹ لیجئے۔ اور زیورخ میں مجھے بغلی دروازے سے نکال دیجئے گا کہیں کوئی بلا ٹکٹ سمجھ کر پکڑے۔

جرمنی میں ٹالینڈ میں، سوئٹزرلینڈ میں ٹراموں اور بسوں کا بھی یہی دستور ہے۔
 ہماری ٹرام کی طرح بیسیوں دروازے نہیں کہ چکیر ڈال ڈال اور مسافرات پات
 ادھر ڈوبے ادھر نکلے۔ بس ایک دروازہ ہے۔ اس میں سے آیتے ٹکٹ بابو کے
 سامنے سے گزریئے وہ ہر ایک کو ٹکٹ دے گا یا چیک کرے گا۔ جب جی چاہے
 گا ایک بٹن دبا کر سارے دروازے بند کر دے گا۔ جب چاہے گا کھولے گا۔
 ایک بڑے میاں بندوق لئے اپنے غریبوں کے کھیت پر پہرہ دے
 رہے تھے۔ ایک راہ گیر نے کہا۔ کیسے ہیں یہاں کے لوگ؟ بڑے میاں
 بولے بڑے ایماندار ہیں۔ کیا مجال جو میرے غریبوں کو ہاتھ لگائیں۔
 راہ گیر نے کہا یہ بندوق آپ نے کیوں سنبھال رکھی ہے۔ بڑے میاں
 بولے ان کو ایماندار رکھنے کے لئے۔

اس ایک جواب میں یورپ والوں کی ایسا نداری کی خلا سنی آجاتی ہے
 پوری نہیں تو بڑی حد تک۔

پھر پیرس

۱۲ / نومبر ۱۹۶۷



شامتِ اعمالِ ماصورتِ پیرس گرفت

زیورخ سے ہمارا اچھا خاصہ سیدھا پرانا جاتا تھا لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے شامتِ اعمالِ ماصورتِ پیرس گرفت۔ ہم نے سوچا جلدی کیا ہے۔ اتوار کی صبح پیرس چلے جائیں۔ ایک شام اور شب وہاں گزاریں دوستوں سے مل لیں۔ پیر کی دوپہر پرانا روانہ ہو جائیں گے لہذا ایک جرمن دوست کو جو پیرس میں رہتے تھے۔ ایجنس پیرس مار سے مطلع کیا کہ ہم نزولِ اجلال فرما رہے ہیں۔ ہمارے لئے کوئی مناسب ہوٹل مقرر کر دو۔ اور باشم کو پاکستانی سفارت خانہ میں فون کر دو کہ رات کو اپنے سامن میں تھوڑا پانی اور ڈال لے اور بازار سے دو روٹیاں لے لے۔

سوئٹزرلینڈ کے لئے ہمیں جو جیب خرچ ملا تھا وہ ہفتے کی شام تک سٹخ ہو چکا تھا۔ زیورخ میں ایک شب اور ٹھہرتے تو ساڑھے سترہ فرانک اور جتنے پھیلی بار ہوٹل مالاریہ ہم پچیس فرانک دیتے تھے۔ بعد میں تو ایک پاکستانی ناصح مشفق نے بتایا کہ تم تو گھر لٹا رہے ہو۔ میں تو پیرس میں عین یونیسکو کے دفتر

کے بغل میں کوچہ گیری بالڈی کے ہوٹل رزاریو میں پندرہ فرانک میں ٹھہرا تھا بس وہاں چلے جانا۔ ایک رات کی قویات ہے۔ اچھا بھلے مانسوں کا ہوٹل ہے۔ البتہ انگریزی وہ نہیں جانتے۔ فرنج بولتے ہیں۔ ہم نے کہا مضائقہ نہیں۔ ہم بھی بہت فرنج جانتے ہیں، وہ ہم سے زیادہ تصوڑی جانتے ہوں گے۔ احتیاطاً ہم نے اپنے بحث میں ہوٹل کے لئے بیس فرانک کی مدد نکالی، ایک وقت کا کھانا لاشم کے ہاں فرض کیا دوسرے وقت کے سینڈوچوں کے لئے پانچ فرانک رکھے، باقی ٹیکسی قلی بس وغیرہ کے لئے آٹھ دس اور ارادہ یہ تھا کہ پیرس میں اتر کر ہوٹل میں مسلمان رکھ سیدھا میوزیم دودر کا رخ کریں گے۔ ایک تو آرٹ کے شاہکار دیکھ کر ذہن میں کچھ وسعت اور علمیت میں کچھ نکھار پیدا ہوگا۔ دوسرے پیسے بچیں گے جو بازار میں گھومنے پھرنے کی صورت میں لامحالہ خرچ ہوتے ہیں۔

لیکن وہ جرمن دوست اخلاق کا مارا ہمیں ہوائی اڈے پر لینے پہنچ گیا۔ بولا ہوٹل تمہارے لئے ٹھیک کر دیا ہے۔ مناسب دامنوں کا ہے اور یونیسکو سے چنداں دور نہیں۔ لیکن اس وقت تو مسلمان میری کار میں رکھو۔ میرے گھر چلو دوپہر کا کھانا میرے ہاں — شام کے پانچ بجے تک کے لئے میں نادر ہوں۔ باتیں کریں گے، شام کو تمہارے ہوٹل تمہیں چھوڑ آؤں گا اور ہاں میرا گھر ورسائی کے پاس ہے۔ تم نے ورسائی کا محل نہیں دیکھا وہ بھی دکھا دوں گا۔

ہم نے کہا: ”ہمارا عزم تو فورہ کا تھا“

بولے ”فورہ“ رات کو دیکھ لینا“

ہم نے کہا: ”رات کو کھلا رہتا ہے“

بولے : ہاں۔ رات کو تو نہیں کھلا رہتا :

یہ صاحب پاکستان میں رہ چکے تھے اپنے گھر میں انھوں نے پاکستان کے پہلے
 بدھنے۔ تو بے پرائی۔ ایک دو بے ڈول سی ڈھولیاں، کان بھڑی سارنگیاں اور
 اونٹ کی کھال کا ایک عیوب سجا رکھا تھا جس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ بڑے غر سے
 دکھاتے رہے۔ ایک کتابھی وہ پاکستان سے اپنے ساتھ لے گئے تھے جس کا نام
 کراچی خاں رکھا تھا اور اس سے اردو بولتے تھے دہشت اچھا گرم پانی بشکریہ
 چائے لائو وغیرہ) اس سے انھوں نے ہمارا تعارف کرایا۔ ہمارے ہاتھ چٹوڑے،
 ہماری پتلون چٹوڑی، ہمارا قمیص چٹوڑا۔ ہم کتوں کو منہ نہیں لگاتے۔ منہ تو کیا ہاتھ
 ایک نہیں لگاتے لیکن اس وقت ہی کراکر کے نہایت خندہ پیشانی سے خواجہ سگ
 پرست بنے رہے کہ اگر بزراری دکھائی، تو یہ شخص کے گاکو دیکھو اس شخص کو پاکستان
 اور پاکستان کی چیزوں سے اتنی بھی محبت نہیں ہے۔ وہ تو ہم نے باتوں باتوں میں
 جتا دیا کہ ہم محبت کی ظاہری نمائش پسند نہیں کرتے ورنہ کیا عجب ہے ہمیں اور اس
 کتے کو کھانا بھی ایک ہی پیٹ میں ڈال دیتے کیونکہ وہ پاکستان میں کئی کئی آدمیوں
 کو ایک ہی پیٹ میں کھاتے اور ایک ہی ڈونگے سے ایک ہی ٹکے میں سے نکال نکال
 کر پانی پیتے دیکھو چکے تھے اور اسے مستحق بتاتے تھے کہ آپس میں محبت اور اخوت
 بڑھانے کا عمدہ ذریعہ ہے۔

ورسائی کے بستے میں ہم نے یونہی پوچھ لیا کہ یہ ہوٹل جو آپ نے ہمارے
 لئے پسند کیا ہے۔ کیا نام ہے اس کا، کیا نام ہیں اس کے ؟

بولے: ”ڈوبی ہوٹل نام ہے۔ پینتالیس فرانک کا ہوگا۔ اس سے زیادہ کا کیا ہوگا۔“

ہم نے کہا: مذاق کو چھوڑیے، پہنچ چکے ہیں۔
 فرمایا: مذاق کی کیا بات ہے۔ ۴۵ فرانک کچھ زیادہ تو نہیں۔
 ہم نے کہا: آپ کو معلوم ہے ہم کوئی ریوے تو ہیں نہیں۔ جیسے کھانے پینے
 کپڑے، دھوبی، نائی، بس گاڑی یہ وہ سارے اخراجات کے لئے کل چالیس فرانک
 ملتے ہیں اور اب چونکہ ہم فرانس اپنی خوشی سے آئے ہیں۔ یہ بھی نہیں گے۔ ہمارا
 انتظام تو پندرہ سولہ فرانک والے ہوٹل میں کیا ہوتا بلکہ لیٹن کوارٹر میں تو سٹ
 آٹھ فرانک روز والے ہوٹل بھی ہیں۔
 بولے: اب تو ہو گیا؟

”۴۵ فرانک۔ ۴۵ فرانک خداوند ہم یہ کیسے دیں گے۔ کہاں سے دیں
 گے۔ ہمارا تو سارا اندوختہ پانچ پونڈ ہے یعنی کوئی ساٹھ پیسہ فرانک اور ابھی
 اتنا لمبا سفر ہے۔“ ہم اس اوجھڑ بن میں لگ گئے۔ فرمایا۔ یہ سامنے درستی
 کا محل ہے۔ اس میں پہلی جنگ عظیم کے بعد وہ معاہدہ ہوا تھا۔ جسے معاہدہ
 درستی کہتے ہیں۔

ہم نے کہا: اچھا ہے، (لیکن یہ ۴۵ فرانک کا کیا ہوگا)
 بولے: خوبصورت ہے نا؟

ہم نے کہا: بہت خوبصورت ہے (۴۵ فرانک) کیا کہنے (۴۵ فرانک)



اب انھوں نے محل کے احاطے کے باہر اپنی گاڑی ایک جنگل غریبی کر دی اور کہا
 آؤ تمہیں پارک دکھاؤں ۔

ہماری آتش شوق اس دوران سرد ہو چکی تھی ۔ ہم نے کہا : ” نہیں اب
 شہر چلیں گے “ (۴۵ فرانک)

بوسے : واہ پارک دیکھے بغیر چلے جائے گے ۔ یہ دیکھو یہاں سے آکر ذرا منظر
 دیکھو کتنی دور تک روشنی کا سلسلہ چلا گیا ہے اور وہ دُور نہر کا پانی دیکھ رہے ہو ؛
 ہم نے کہا : ” نہر کا پانی ؟ ہاں ہاں دیکھ رہے ہیں “ (۴۵ فرانک)

اب وہ بوسے : اب تمہیں دوسری طرف کا پارک دکھاؤں ۔ ذرا دیکھنا کہ چٹوس
 اور پودوں کا تناسب کتنا آرٹسٹک ہے اور یہ بُت اور یہ مجسمے !

ہم نے کہا: "اں یہ بُت یہ مجھے۔ بڑی عالی شان چیزیں ہیں اب چلیں شہر"
 بولے ابھی نہیں۔ ابھی تو باتیں ہاتھ کا پارک دیکھنا ہے۔

ہم نے کہا: "نہ بس۔ ہم تو اتنا ہی دیکھ کر مبہوت ہو گئے۔ واقعہ بہت ہی
 طبیعت خوش ہوئی (اُسے شخص) اچھے تو تنخواہ پیرس میں فرانکوں میں ملتی ہے
 ہمارا تو بیڑہ ڈبو دیا۔ تو نے)

واپسی میں ٹریفک کے رش میں خاصا وقت لگا۔ خاصا اندھیرا ہو چلا تھا۔
 جب ہم ہوٹل پہنچے ہیں۔ جرمن دوست نے باہر ہی سے ہاتھ ملایا اور روانہ
 ہو گئے۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے ہوٹل میں قدم رکھا۔ کونٹر پر ایک ترش رُوح صاحبہ بیٹھی
 تھیں۔ ہماری زبان سے پورا فقرہ بھی نہ نکلا۔ سب صرف دنگو بھول گئے تھے۔
 ہم نے کہا "مکہ۔ ہمارا نام ابن انشا"

بولیں۔ اں ہاں سن لیا۔ مکہ سے تیار ہے؟
 کہتے کا ہے؟

فرمایا: "چھیا سٹھ فرانک کا؟"

جہیں یقین نہ آیا۔ دوبارہ پوچھا۔

بولیں: "ساتھ جمع چھ۔ چھیا سٹھ۔ مکہ کے ساتھ ہاتھ روم بھی تو ہے۔"

ہم نے کہا: "ہاتھ روم کیوں ہے۔ ہمیں تو بس چھوٹا سا سنگل مکہ چاہیے
 تھا۔ نہانے کا ہمارے سامنے نام مت لو۔ ہم افیم کھاتے ہیں۔ یوں بھی مروجی

کاموسم ہے۔ پانی گیلتا ہوتا ہے نا :-
 بولیں : یہی کمز ہے۔ اور کوئی نہیں :-
 ۴۵ فرانک کبھی نہیں ؟
 ”نہیں“

ہم نے کہا :- اگر ہم کسی اور ہوٹل میں چلے جائیں تو ؟
 فرمایا :- شوق سے چلے جاتے۔ لیکن کل — یہ ایک دن کے تو پھیلا سٹو
 فرانک ہم وصول کریں گے ہی :-
 ہم نے دروازے کی طرف دیکھا وہاں گھنٹی موچھوں والا ایک ہٹا کٹا دربان کھڑا
 خشونت سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ہم نے کہا ہم تو یونہی کہہ رہے تھے۔ مذاق کر رہے
 تھے۔ بھلا اور کہیں جانے کا کیا سوال ہے۔ ہمیں تو کوئی کسے بھی تو نہ جانتی :-

ڈربئی (ہوٹل) کی ریس کون جیتا؟

کمرہ نمبر ۸۔ ڈربئی ہوٹل۔ ڈربئی کے نام پر ہم گھوڑے کی طرح ہنہناتے اپنے سوٹ کیس پر دولتی جھاڑی۔ ٹھسی ہوئی درمی، ٹیڑھی دیواریں۔ کمرے کے دو حصے تھے۔ دونوں میں ایک ایک پنک۔ ہم نے بجلی کا بٹن دبایا تو کمرے کے دوسرے حصے میں روشنی ہوئی۔ وہاں بھی ایک بٹن تھا۔ اس سے ادھر کا کمرہ روشن ہوا۔ غسل خانہ بھی تھا اور دروازے کے اندر ایک نوٹس بھی لٹکا تھا کہ اس کمرے میں تین آدمی رہیں تو ۷ فرانک دیں۔ دوڑیں تو ۷ فرانک اور ایک آدمی ہو تو نقطہ ۶۶ فرانک۔ ہم نے غنیمت جانا کہ ہم ایک ہی آدمی ہیں۔ ورنہ ۸ فرانک دینے پڑتے۔ ۸ فرانک کی تو سیدھی سیدھی یہ بچت ہو گئی۔

ہم نے ٹیلی فون اٹھایا۔ پاکستان سفارت خانہ "ہاشم"

بولے: "ہاں آگئے۔ آجاؤ"

کیسے آئیں؟

بولے: "پیرس میں ٹیکسیوں کی کمی نہیں ہے"



derby-hôtel

5, avenue duquesne, 5

paris (7e)



ہم نے کہا: ہم سے ٹیکسی دیکھی کی بات مت کرو۔ ہم تو شر کو پیدل چل کر دیکھنے
کے عادی ہیں اور پھر پریس جیسا شہر! تمہارا گھر دور تو ہے یاں پہنچ جائیں گے
کوئی پون گھنٹے میں۔ اور اں کھانا مانا چاہتے کہیں کا نی وغیرہ پر ٹہلنے کی کوشش
کرو۔۔۔۔۔!

بھٹکتے، نقشہ دیکھتے، شرکوں کے نام پڑھتے۔ پانچ ہونڈ کو تیرہ سے ضرب
دے کر اُن کے فرانک بناتے۔ جیبوں میں مختلف ملکوں کی پچی ریز گاری گنتے۔
باشم کے گھر پہنچ گئے۔ ہم نے جلتے ہی کہا۔
”آدم بو۔ آدم بو کھا نا کھاں ہے“

بوسے بیاں نہیں ہے۔ ایک دیت نامی رستوران میں کھلائیں گے تمہیں
ایک دو دوست اور بھی ساتھ ہوں گے۔ کہو، سفر تو اچھا گزرا۔
ہم نے کہا: فضول باتیں ہم سے مت کرو۔

یہ دیت نامی رستوران بہت پُر اصرار ساتھ انیم تار یک کمروں میں جاے لگے ہوتے۔ فرنیچ پر پھٹے کاغذوں اور کوڑے کے انبار۔ لکڑی اور ٹین کی جھولتی ہوئی کرسیاں، ایک چھوٹے نکلا ہوا صوفہ۔ دیواروں پر کچھ پوسٹر۔ کچھ پتہ نہ چلا کہ ہنوتی والے دیت نامی ہیں یا سائیکلوں والے۔ ہمارے ساتھ ایک صاحب فرنیچ داں تھے۔ انھوں نے کونٹر پر جا کر طویل مذاکرات کئے اور اس کے بعد پیسے ادا کئے۔

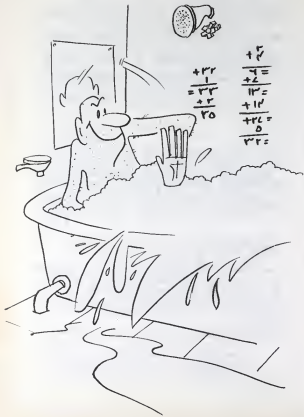
ہم نے کہا: یہ کیا ہے؟

بوسے، اس رستوران کا دستور ہے پیسے پہلے لیتے ہیں۔ کھانا بعد میں دیتے ہیں۔ لاتے ہیں سرور اول۔ دیتے ہیں شراب آخر۔

یہ رستوران بس اللہ کی رحمت کا محمدی ہوٹل تھا۔ شکر عورتیں پتھر کی میزوں پر پوچی پھرتی اور کھانا پر دستی ہوئی۔ ہم چھ ساڑھے چھ آدمی (اسٹم کی بگم اداں کا بچہ تین نوے بھی ساتھ تھا) ایک چھوٹی سی میز پر آپس میں گھٹنے بھرتے ہوئے بیٹھے۔ چاول آتے۔ پیالوں میں کچھ دھوون سا آیا۔ پھر چینی رستوران کا سا کھانا لال مرحوں کی چٹنی بھی۔

دھوون تو ہم نے نہ سکے چاولوں پر تھوڑا سا چکن کا ٹکڑا رکھا۔ مرچیں ڈالیں اور چمچے سے نوش کر گئے۔ اسٹم نے مہذب بننے کی کوشش میں پہلے اپنا کانا زمین پر گر لیا پھر بگم کا کانا نکالا اور گرایا۔ ان کچھ چاول ہم نے بھی گرائے۔

اتنے میں گیارہ بجے کا عمل ہو گیا۔ ہوٹل ڈربلی کے خیال سے وحشت ہو رہی تھی لہذا اسٹم سے ہم نے کہا آں ہمیں پیرس کی گلیوں میں گھماؤ۔



جانے یہ رستوران کہاں واقع تھا اور ہم کن کن کوچوں سے ہو کر نیکے بعض
سڑکوں پر تو اس طرح چراغاں ہو رہا تھا۔ جیسے جہازے اس خود دولتوں کی بیاہ
شادیوں میں ہوتا ہے۔ شاید کرمس کی ریہرسل تھی۔ یہ پرانی سبزی منڈی ہے جسے
اب ڈھایا جا رہا ہے۔ یہ پگال ہے۔ عوامی کلبوں کی قطار در قطار۔ یہ شاتلے تیز
روشنیوں تلے دعوتِ نظارہ اور دعوتِ نہ ہانے کی کیا! گاہک منڈلاتے ہوئے۔
ہم نے اسٹم سے کہا۔ خیر ہو چکی سیر۔ اب واپس!

”چھیاٹھ فرانک“

ہم نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی چیز ڈھنگ کی ہو تو بطور فرانس کی
یادگار کے اپنے سوٹ کیس میں رکھ کر لیتے چلیں۔ سوائے کپڑے ٹانگنے کے معمولی ہنگروں
کے کچھ بھی نہ تھا۔ نیند ہماری غائب ہو چکی تھی۔ ہم کاغد پسلے کر بیٹھ گئے اور حجاب
بھڑنے لگے۔

ہمارا ارادہ تو پندرہ فرانک والے ہوٹل میں ٹھہرنے کا تھا لیکن ممکن ہے
اس میں کمرہ نہ ملتا۔ لہذا پچیس فرانک دیتے۔ گویا یہاں فقط ۲۱ فرانک رانڈے
رہتے ہیں۔ بائٹم کے گھر پیدل جا کر بچاتے کم از کم پانچ فرانک۔ کل ایئر پورٹ پر قلی
نہ لیں گے سامان خود اٹھائیں گے۔ مزید بچت تین فرانک۔ کل دو پہر فائدہ کریں گے
کہ معصے کے فعل کو درست دکھتا ہے۔ اس چلتے پی لیں گے بچت چھ فرانک۔

بقیہ سفر میں اخبار نہیں خریدیں گے — پانچ فرانک
بال نہیں کٹوائیں گے — پانچ فرانک

تھر خط نہیں لکھیں گے ————— دو فرانک

یہ ہو گئے چھ بیس فرانک ابھی ہمیں پندرہ فرانک اور بچانے تھے۔

اچھا تو بیروں کو ٹپ بھی نہیں دیں گے۔ یہ مونچھوں والا دربان ہمیں یوں بھی پسند نہیں اور سوٹ کیس ہم خود اٹھا کر لائے تھے۔ مزید بھت تین فرانک۔

ان کا ایک تو یہ اٹھا کر اپنے سامان میں رکھ لیا۔ چار پانچ فرانک کا تو ہو گا ہی لیکن اس پر تو ہوٹل ڈربی لکھا تھا۔ اور پھر ہمارے سوٹ کیس میں جگہ بھی نہ تھی۔

لہذا اس خیال کو رد کر دیا۔ جب اتارنے کا خیال بھی نہ چھا کیونکہ ان لوگوں نے پیش بندی کر رکھی تھی۔ بہت اونچا لگا رکھا تھا اور ابھی ہمیں بارہ فرانک بچانے تھے۔

ہم نے سوچا۔ اتنا اونچا ہوٹل ہے۔ ناشتے میں انڈا ضرور دیں گے جو پندرہ بیس فرانک دے ہوٹل نہیں دیتے۔ آدھے فرانک کا انڈا ہوا۔ باقی ساڑھے گیارہ فرانک یاد آیا کہ نو روہم نہیں جا پاتے۔ جلتے تو ملٹ لینا پڑتا ورنہ گائیڈ بک یا کارڈ خریدتے تین ساڑھے تین فرانک اس میں لگانے چاہئیں۔

اب بس آٹھ فرانک کا حساب ہمیں اور جوڑنا تھا۔

کیوں نہ ان کا لفٹ بار بار استعمال کر کے ان کی بھی خرچ کریں۔ سیرٹھیوں پر سے اترنے میں جو تے کی جو گھسائی ہوتی ہے وہ بھی بچے گی۔ دو فرانک اس مد میں بھی بچائیں۔

باقی رہے چھ۔

ایٹل ٹرے اٹھا کر تھیلے میں ڈال لی۔ ایک فرانک اس کے دام لگائے۔
باقی پانچ فرانک۔

غسل خانے میں سے صابن بھی اٹھا کر تھیلے میں رکھا۔ باقی چادر۔
 اتنے میں یاد آیا کہ ایسٹر ڈم اور لون وغیرہ میں ڈھائی ڈھائی فرانک منانے
 کے دیئے تھے۔ یہاں غسل خانہ موجود ہے۔ ایک اب نہایت۔ ایک کل صبح اٹھ کر
 نہایتیں۔ یعنی پانچ فرانک یہ وصول کریں۔

گویا ایک فرانک کا فائدہ ہمیں ملا۔ ہمارا چہرہ خوشی سے کھل گیا اور ہم
 کپڑوں سے باہر ہو کر شب میں بیٹھ گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا توازن اداسی کی موافق ہونے کے باوجود ہمارے دل
 کا غبار ابھی تک پورا نہ دھلا تھا۔ لہذا ہم نے شب میں بیٹھ کر غزل گاتے ہوئے
 (ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے) خوب پھینٹے اڑاتے کہ خود ہی فرشت
 صاف کرتے پھریں گے۔ گویا ایک آدھ فرانک کے تلے اور ان لوگوں کو دیا یا۔
 ہم عموماً کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتے لیکن جو لوگ دوسروں کو لوٹنے کی کوشش
 کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی ہونا چاہیے۔

پراگ (۱۳ نومبر تا ۱۷ نومبر) اور وارسا

(۱۸ نومبر تا ۲۰ نومبر) کا احوال لکھا نہیں جاسکا

ویانا

۲۱۰۲۰ نومبر ۱۹۶۷



ویانا — (اوپرا) دنگ اسٹرا میں آپرا (نیچے) مشہور بازار گریسین



ہم ویانا پہنچتے ہی ڈی ویلیو ہو گئے

مولوی محبوب عالم ویانا گئے تھے تو ہم کیوں نہ جاتے۔ یہ سچ ہے کہ آنکھوں والوں کے لئے ویانا میں بہت کچھ ہے۔ مثلاً آنکھوں کی چیدہ بیماریوں کے ہسپتال ہمارے بہت سے آئی اسپیشلسٹ ہیں سے بصیرت حاصل کر کے گئے ہیں۔ لیکن ہم جو اپنی سیدھی راہ چھوڑ کر ویانا گئے تو اس میں مولوی محبوب عالم سے ہمارے جذبہ مسابقت کو بہت دخل تھا۔ ویانا کسی طرح ہمارے پروگرام میں نہ آتا تھا اور سبھی ملکوں میں تو ہمارا کچھ نہ کچھ جھوٹا سچا منصوبہ ہی کام تھا۔ یہاں ہمیں از خود رہنا اور اپنی گروہ سے خرچ کرنا تھا۔ ہم نے ہوائی اڈے پر آ کر فرمائش کی کہ کوئی سستا سا بغیر غسل خانے کا ہوٹل بتا دو۔ ہم نے تو سرائے کہا تھا لیکن یہ لفظ وہاں کوئی نہ سمجھا۔ انھوں نے کہا: اچھا۔ کانگریس ہوٹل میں چلے جاؤ۔ ایک سو میں شنگ روزانہ دے دینا۔ ہم نے کہا۔ ہم پرانے مسلم لیگی ہیں۔ آج ملک کانگریس سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ اب اس میں کیوں داخل ہوں۔ اس پر اور غیر کانگریسی ہوٹل انھوں نے بتائے لیکن وہ زیادہ منگے تھے۔ آخر ہم نے کہا: میاں آزاد چلو

وہیں چلو۔ شیرید حایت رہتا ہے وقت رفتن آب میں۔

ایک سو میں شلنگ کچھ کم نہیں۔ ہم نے حساب لگایا تو جلد اسٹھے لیکن یہ جان کر قدرے سکون ہوا کہ یہ برطانوی شلنگ نہیں ہیں بلکہ ایک ڈالر میں پچیس دلے ہیں۔ ایک روپے میں پانچ جانے۔ ڈالر والہ کی کیا حقیقت ہے ہم پیسے دلے آدمی ہیں۔ ہماری جیب میں پانچ پانچ پونڈ کے نوٹ تھے۔ ایک نہیں دو تین۔ ہم نے ایک پھینکا کہ لاؤ شلنگ دے دو۔ ایکسچج دلے نے اسی طرح اٹھا کر ہمیں دے دیا اور کہا۔ یہ نہیں چلے گا۔ کوئی اور سکہ ہے تو لاؤ۔

ہم نے کہا: کیوں کھوٹا ہے کیا؟

بوسے، کھوٹے کھرے کا میں نہیں جانتا لیکن فی الحال اس کا بھاد نہیں

نکلا۔

ہم نے کہا۔ بھاد ہم بتاتے ہیں ایک پاؤنڈ میں ۲۰۰ ڈالر ہوتے ہیں۔ احتیاطاً لکھ لو۔

بولا، جی نہیں۔ اب نہیں ہوتے۔ آپ نے اخبار نہیں پڑھا۔ آج سے پونڈ ڈی ویس ہو گیا۔

ہماری آنکھوں کے آگے سارے ناچنے لگے۔ ہمیں کبھی گمان نہ ہوا تھا کہ حکومت برطانیہ ہماری پشت میں یوں چھرا گھونپے گی۔ ہم سے صلاح کئے بغیر اسٹرلنگ کی قیمت گھٹا دے گی۔ یہ جو عرب ممالک کے اتنے سارے اسٹرلنگ برطانوی بینکوں میں ہیں ان کا کیا ہوگا۔ امیر کویت کو۔ شاہ سعودی عرب کو۔ سلطان ابو ظہبی کو اور خود ہمیں برطانیہ کے اس عمل سے جو نقصان پہنچا ہے اس

کی ذمہ داری کس پر ہے۔

ہم نے چور ٹرسے پوچھا : میان یہ سامان کہاں لئے جا رہے ہو جارا۔ ہماری اقتصادی حالت خراب ہو گئی ہے۔ کوئی جہاز قاہرہ جانے والا ہو تو اس میں بے چلو کراچی جانے والا ہو تو اور اچھا ہے۔

بولا : جی کراچی کا تو پتہ نہیں، قاہرہ اب پر سوں جائے گا جہاز جلدی کیجئے شہر کی بس چھوٹنے والی ہے۔ دس شلنگ غایت فرمائیے۔ دوا کے مرنے شکر یہ !

اس قسم کی ہم پر چوٹ پڑے تو ہماری فینڈ تو بے شک حرام ہو جاتی ہے۔ اور کوئی خاص پروا ہم نہیں کرتے۔ چنانچہ ہوٹل میں فروکش ہوتے ہی ہم نے مووی مبسوط عالم کا سفر نامہ نکال لیا۔ اتنے میں میجر صاحب نے فون کیا کہ آپ ویانا کا شینہ ٹوریس گئے؟ آٹھ بجے شروع ہوگا۔ منے کا ہے۔ بس جگہ جگہ گھمائے گی۔ رستہ رازوں میں۔ باغوں میں رقص گاہوں میں اور آخر میں ایک عمارت کلب میں بھی لے جائے گی۔ وائن یعنی شراب کا بھی انتظام ہے۔

”پورک یعنی سور کے گوشت کا بھی؟“ ہم نے پوچھا

بولے : ”جی ہاں“

ہم نے کہا : ”یہ انتظام ہوٹل کی طرف سے ہے؟ یعنی ہمارے کرائے میں شامل ہے۔“

میجر صاحب نے کہا : ”جی ٹکٹ آپ کو یہیں سے مل جائے گا۔ آپ کے بل میں ہم لگا دیں گے۔ دو سو شلنگ کا ہے۔“

ہم نے کہا : ہمیں پریشان مت کرو۔ ہمیں نیند آرہی ہے اور پورک
 ہم نہیں کھاتے ؟
 یہ کہہ کر ہم پھر سفر نامے میں جُٹ گئے

معلوم ہوا کہ اے افد کے بندے اگر تجھے ویانا دیکھنا ہے تو مینہ بھردہ
 ہفتے دو ہفتے کو یہاں ٹھہر۔ میوزیم، لائبریریاں، محل، ادرا، تھیٹر، باغ،
 کوچے بازار۔ آج بے شک آسٹریا کو لوگ سیاسی طوفان پر شمار میں نہ لائیں
 لیکن ایک زمانے میں تو یہ غالباً یورپ کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ یہ چکوروکیہ
 ہنگری، جرمنی وغیرہ سب زیرِ نگیں تھے۔ ویانا یورپ کا قلب تھا۔ آج سے تین
 چار صدی پہلے تو جب ترکوں کا اقبال اُساں پر چٹمک زنی کرتا تھا۔ انھوں نے
 ویانا کو بھی اپنی جاگیر میں شامل کرنے کی کوشش کی تھی۔ پہلی دفعہ سلطان سلیمان
 ثانی نے ۲۲ ستمبر تا ۱۵ اکتوبر ۱۵۲۵ء اور دوسری بار تارکے صدرِ عظم
 ترکی نے ۱۴ جولائی تا ۱۲ ستمبر ۱۶۸۳ء ویانا کا محاصرہ رکھا۔ لیکن آسٹریا کی مدد
 پر اہل پولینڈ آگئے۔ اہل یسکسی آگئے۔ اہل بویریا آگئے اور اہل فرانس آگئے
 ان کی متحدہ قوت کے سامنے ترکوں کی ترکناز کامیاب نہ ہو سکی۔ ورنہ ؟ ورنہ
 کا مولوی محبوب عالم نے بھی سوچا۔ ہم نے بھی سوچا۔ یہ جو سامنے جا بجا گرجوں
 کے ٹکیلے مینار نظر آتے ہیں۔ کیا عجب یہاں سلیمانہ اور نینی جامع کی سی مسجدوں
 کے گنبد ہوتے۔

آج سے ستر سال پہلے کا ہندوستان دیکھتے جہاں سے مولوی محبوب عالم

آئے تھے۔ اور ترمسال پہلے کا دینا۔ بیان کرتے ہیں کہ ہٹلوں میں لفٹ تھے۔
 ٹرائیں کچھ دفعتی تھیں۔ کچھ بجلی سے چلنے والی بھی جیسی آج کل ہیں۔ اخبار لاکھوں
 کی تعداد میں چھپتے تھے۔ مولوی صاحب نے اخبار ”ویزناک بلاٹ“ کا کارخانہ دیکھا
 معلوم ہوا کہ ایک لاکھ پرچہ ہر روز چھپتا ہے اور صبح و شام دو مرتبہ شائع ہوتا ہے۔
 اس کارخانہ میں ایک ہزار آدمی ملازم ہیں۔ تمام کام کلوں سے ہوتا ہے۔ سکتے کے
 حدود بھی لینٹو سٹاپ کلوں کے ذریعے جوڑے جلتے ہیں کہیں مشینیں چھاپنے
 کی موجود ہیں۔ لیکن سب سے بڑی مشین ایک گھنٹے میں ۲۲ صفحے کے ۲۲ ہزار
 اخبار چھاپ کر کاٹ کر اور موڑ کر رکھ دیتی ہے بلکہ شمار کرنے والی مشین بھی ساتھ
 لگی ہے جو خود بخود بتلاتی جاتی ہے کہ کتنا اخبار چھپ چکا۔ یہ کارخانہ برقی طاقت
 سے چلتا ہے۔ مولوی صاحب نے دینا کے عجائب گھر دیکھے۔ تھیسٹر دیکھے پارلیمنٹ
 ہاؤس دیکھی۔ پارٹر کے عجائبات دیکھے کہ ایک وسیع پارک ہے جس میں تفریح کی
 بے شمار چیزیں ہیں اور جس میں ہمیشہ میلہ لگا رہتا ہے۔ دینا کی خوش دل عورتوں نے
 ان سے چہلیں بھی کیں۔ مولوی صاحب نے چونکہ صرف گفتنی درج گزٹ کیا ہے۔
 لہذا ان کے رد عمل کا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لکھتے ہیں: ”پارک میں سڑک ہے
 دونوں طرف درخت ہیں۔ درختوں کی تمام شاخوں پر سرخ سبز اور سفید روشنی
 کے برقی میپ لگے ہیں۔ ایک ہٹن دبانے سے سب میپ روشن ہو جاتے ہیں اور
 بالکل ظلمات کا باغ معلوم ہونے لگتا ہے۔ مختلف رنگوں کے باریک کاغذوں کے
 گول گول ٹکڑوں کی لوگ ٹھیاں بھر بھر کر ایک دوسرے پر چپکتے ہیں۔ عموماً مرد
 خوب صورت عورتوں پر اور عورتیں مردوں پر۔ پہلے واقفیت اور آشنائی کی کوئی

شرط نہیں جس پر تمہارا جی چاہے پھینکو۔ کوئی دادرما د نہیں بلکہ سب لوگ خوش ہوتے ہیں۔ زمین پر دو انگلی موٹا فرش ان کاغذی پھولوں کا ہوجاتا ہے۔ ایک دو عورتوں نے مجھ پر بھی پھینکے۔ جب میں نے جواب نہ دیا تو ایک کم بخت نے پشت کی طرف سے میرے کالر کو اٹھا کر ایک مٹھی اس میں پھینک دی جو میں نے مکان پر جا کر نکالی۔ معلوم ہوا۔ اس ذریعہ سے بعض عورتیں مردوں سے آشنائی پیدا کرتی ہیں۔ یہ ایک پرستان کا نظارہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ انسان ان کے آسیب سے مشکل سے بچ سکتا تھا۔ باروت و ماروت کی آزمائش کا قصہ اگر صحیح ہے تو وہ معذور تھے۔“

لیکن میاں انشا کو تو بس دو روز یہاں ٹھہرنا تھا۔ اور ان کے پونڈ ڈی ویلیو ہو گئے تھے اور یہ موسم سردیوں کا تھا۔ اور یہ حسینا میں مدحینا میں جانے کہاں تھیں اچھا تو کل پر اتر کر سیر بھی کریں گے۔

آج ہم نے جی کڑا کر کے شہر کا ٹورے جی لیا۔ ستر شنگ پیسہ تو ہاتھ کی میل ہے۔ ہم نے تو آج تک اس کی کبھی پروا نہ کی۔

بس اوپر اڈوس سے چلی۔ گائیڈ نے کتنا باچنی شروع کی۔ یہ رنگ ہے یعنی یہاں کی سرکھر روڈ۔ ادھر باغ عامر ہے۔ یہ اصرارٹ کا عجائب گھر ہے جو تین سو برس پہلے کے باعث بند ہے اور یہ سامنے تاریک کا عجائب گھر ہے (اس میں بھی نہیں سے کر گیا) اور یہ بچوں کا عجیب گھر ہے۔ اور اب صاحبو! وہ دیکھو پارلیمنٹ کا ایوان۔ اچھا تو اب ہم قصر حکومت کے سامنے آ گئے۔



ملکہ عالیہ میرزا تھریسا

اس میں پریسڈنٹ رہتا ہے۔ صدر ڈولفس بھی ۱۹۳۶ء میں اس عمارت میں قتل ہوا تھا۔ یہ قیصر گرفت KAISERGRUFT ہے۔ اس کے اندر چلتے ہیں کیونکہ اس میں بادشاہوں کے تابوت رکھے ہیں۔ یہ فرز جوزف کا تابوت ہے یہ ملکہ ماریا تھریسیا کا۔ یہ فلاں بادشاہ کا۔ یہ فلاں ولی عہد کا۔ اور اب چلو باہر یہ پرائیمر جابھی دیکھو یہ مشہور سرک ہے۔ میرا ہنر سڑ اس شاپنگ کے لئے بہترین جگہ دہم نے فوراً نام نوٹ کر لیا۔ کہ کوئی یہاں آئے گا تو اسے لکھوا دیں گے۔ یہاں خریداری کرے اور اب صاحبو یہ سامنے مشہور برن پلس ہے۔ شانان آسٹریا کا محل جس کی تعمیر میں ۵۵ برس لگے۔ اس میں چودہ سو کمرے ہیں اور ایک سو چالیس باورچی خانے ہیں۔ ہمیں اس وقت بھوک لگ رہی تھی۔ ہم نے پوچھا۔ اتنے سارے باورچی خانوں میں کیا کیا پکاتا تھا۔ لیکن وہ گائیڈ ہمیں تفصیلات نہ بتا سکا۔ آئیں بائیں شاہیں کر کے رہ گیا۔ یہ محل درساوی کی نقل تھا۔ گائیڈ نے جو یہ حوالہ دیا تو اک تیر میرے سینے میں مارا کہ اُسے اُسے۔ ہمیں فوراً اپنے پھیلاٹھ فرانک پرس دلے یاد آ گئے۔ اب اس کے کمروں کی سیر شروع ہوئی۔ یہ خواب گاہ۔ یہ بیٹھک۔ یہ دربار گاہ۔ یہ رقص کا سال۔ سب ایک سے ایک بڑھ کر۔ سب میں تصویریں۔ یہ ملکہ تھریسیا ہیں۔ یہ ان کے باپ کی تصویر ہے یہ ان کا بیٹا ہے۔ یہ ان کی بیٹیوں کی تصویریں ہیں۔ ہم نے کہا، ماشاء اللہ کتنی اولاد تھی ملکہ عالیہ کی معلوم ہوا سولہ۔ گیارہ ان میں لڑکیاں تھیں اور پانچ لڑکے۔ ایک اور عورت کی تصویر لگی تھی۔ ہم نے کہا یہ کون ہے۔ بولیں یہ ان کی بیٹی ہے۔ اس کی اٹھارہ اولادیں تھیں۔ ہم نے کہا ماشاء اللہ — فیملی پلاننگ کا حکم نہیں تھا۔ ان دنوں کیا ہے؟

میں شاید ابھی تک اس کا رواج نہیں کیونکہ گائیڈ نے پوچھا۔ فیملی پلاننگ کیا ہوتی ہے؟ ویسے ملکہ عالیہ کے یہ اولاد خوب کام آئی۔ سب کی شادیاں زبردستی کر کے یورپ کے نامہداروں سے لیں۔ فرانس کا بادشاہ، اسپین کا بادشاہ، اٹلی کا بادشاہ، یہاں کا بادشاہ کہاں کا بادشاہ۔ سب کو فرزند ہی میں سے کر بغیر تلوار چلتے اور خون بہاتے سارے یورپ کی ملکہ بن گئیں۔ گویا ہمارے کروڑ پتی کا خزانہ اور جو دوسرے کا خزانہ واروں کو اپنی بیٹیاں بیاہتے ہیں۔ یہ نسخہ کوئی نیا نہیں۔ انھوں نے ملکہ ماریا تھریسیا سے لیا ہے۔

ایک سڑک پر سے گزرتے ہوئے گائیڈ نے کہا تھا۔ یہ موتسارٹ MOZART کا جسم ہے اور اب ٹون برس پچیس ہیں بھی کئی تصویریں انھوں نے بتائیں کہ یہ موتسارٹ ہے پانچ برس کی عمر میں۔ یہ پندرہ برس کی عمر میں۔ آخر ہم نے کہا کون تھا موتسارٹ یہ بھی تو بتاؤ۔

تب پتہ چلا کہ بیٹھو دن کی طرح کا کوئی گویا تھا۔ یورپ میں ہم نے جا بجا موتسارٹ بیٹھو دن۔ باغ۔ شو بہت وغیرہ کے مجسمے اور ان کے نام کی سڑکیں دیکھیں جس سے قیاس ہوتا ہے کہ ہر چند اس وقت ریڈیو پاکستان کی شاخیں یورپ میں نہ تھیں۔ نہ فلم کمپنیاں تھیں لیکن گانے بجانے والے جھوکے نہیں مرتے تھے۔ کلا و نوتوں کی خامی سرد تھی۔

اور پھر اس گائیڈ کے بچے نے ٹون برس پچیس سے لونا کر گاڑی پھر اور پرانے سامنے لاکھڑی کی اور کہا صاحبان یہ ٹور ختم۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ امید ہے کہ دیا نا

میں آپ کا قیام خوشگوار گزرے گا۔

یہ کہہ کر وہ ٹپ پھینے کے لئے بس کا دروازہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

ہم نے کہا: میاں پراتر تو تم نے دکھایا ہی نہیں۔ وہ کاغذی پھولوں کی مٹیاں پھینکنے والی پری جال غور تیں کہاں ہیں تمہارے خیال میں ہمیں کچھ پتہ ہی نہیں؟

بولا: پراتر کا ٹور پلاہ بجے شروع ہو گا۔ اس میں دریائے دینیوب بھی دکھائی دے گی۔ اس کا ٹکٹ بھی ستر شلنگ ہے۔ دوں آپ کو؟

پرویس کا معاملہ تھا اور کوئی تھانیدار یہاں ہمارا جاننے والا نہیں تھا۔
نہ ہوا کراچی۔

قاہرہ

۲۲ نومبر تا ۲۸ نومبر ۱۹۷۷



دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار

”مطعم مستنصر خندق ابو صفین، شارع سلامہ، صالون حفیفی، حلوانی الاصل
میدان التحریر“

ہم نے ٹھٹھک کر اپنے کو غور سے دیکھا اور پوچھا، یا شیخ تیرا نام جلد غریب خانہ
تو نہیں ہے؟

جواب ملا ”نہیں“

”ضیاء الحسن موسوی“

اس کا جواب بھی نفی میں ملا تو ہم نے نہایت تاسف سے کہا تو بھیجے۔
والوں نے غلط آدمی بھیج دیا یہاں۔ اے شخص تو کیلینے آیا ہے قاہرہ؟

تھو غلط آدمی کا لڑویا بن رطب اللسان یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک میاں
دہقانی کو قریب شام ایک اجنبی مسافر رستے میں مل گیا۔ اسے وہ اپنے ساتھ لے
آئے۔ کھلا پلا کر اپنے ہی کمرے میں راگرو دہقانی کے مکان میں ایک سے زیادہ
کمرے ہوتے ہیں تو) سلیبا۔ دہقانی میاں کو اگلی صبح تڑکے ہی ایک کام سے دوسرے

گھٹن میں جہان تھا۔ لہذا انہوں نے اپنی ماں سے کہا: 'ماں! کل صبح مجھے بڑے تڑکے اٹھا دیے تھے۔ اور ماں مہمان کو صبح اچھا ناشتہ دینے کے بعد رخصت کیجیو،' ماں نے کہا: 'اچھا بیٹیا'۔

ماں نے تڑکے ہی اٹک لگا دی۔ وہ بتانی میاں نے جلنے کی وحشت میں اپنی بھلتے مسافر کا پا جام پہن لیا۔ (اگر وہ بتانی پا جامے پہنا کرتے ہیں تو) گھر سے دو کوس دور گئے ہوں گے کہ اُجالا ہوا اور اُن کی نظریک سخت اپنی ٹانگوں پر پڑی۔ وہاں اجنبی کا دھارسی وار پا جامہ نظر آیا۔ تو بول اُٹھے۔

'میری ماں بھی کتنی بے وقوف ہے۔ اٹھاتا تھا مجھے۔ اٹھا کے بھیج دیا مسافر کو'

اس روز صبح ہم ڈینیوب کے ساحل پر گھومتے پائے گئے اور شام میں نیل کے کنارے ہوئی۔

ویانا میں آخری دن یورپ میں ہمارا آخری دن تھا اور کوٹاکے کی سردی کا بھی۔ صبح اُٹھے تو باد جو دلپسے اور کوٹاکے کے دم تحریر نہایتی کا جھول معلوم ہوتا ہے، ٹھہر کر رہ گئے اور دستا نے لینے بھاگے۔ کنوڑپ کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ سڑک اور گھاس سب سفید ہو رہی تھی، برت تھی یا پالا، کہہ نہیں سکتے۔ ہمارے پاس اب صرف آدھا دن تھا۔ اس میں نوکر کنڈے میوزیم بھی دیکھنا تھا اور پراثر کی تفریح گاہ بھی۔ پھر نیلے ڈینیوب کی زیارت بھی کرنی تھی۔ میوزیم کوئی دس بجے کھلتا تھا۔ لہذا ہم نے ادپرا کے سامنے سے B & N ٹرام پکڑی اور پراثر کی طرف سدھارے۔ صبح اور سردی کی صبح۔ وہاں اس وقت کیا دھڑا تھا۔ پراثر کے سارے

مرنے تو مولوی محبوب عالم لاٹ کے لئے گئے تھے۔ ہاں نیلے ڈریسنگ سے ہم نے دعا سلام کرنی اور چلے سوئے فوراً کنڈے میوزیم دیس دیس کے رہن سہن کے عجائب گھر مولوی محبوب عالم لکھتے ہیں :-

”اس میں ہندوستان کی دیہاتی زندگی کا نقشہ چند کاشت کاروں کے بُت بنا کر دکھایا گیا ہے۔ یہ بنگالی کے مزارع تھے۔ سیاہ خام اور بالکل برہمن تھے۔ ان کے پاس چھپر کا ایک جھوٹا تھا۔ اگر ان کو دیکھ کر یہاں کے لوگ سب ہندوستانیوں کو ایسا ہی سمجھیں تو ان کا کچھ تصور نہیں۔ چنانچہ جب میں عجائب گاہ سے نکلا تو ریل نے میرے گائیڈ سے پوچھا کہ ان کپڑوں کو جو میں اس وقت پہنے ہوئے تھا۔ وطن میں جا کر کیا کروں گا؟ وہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان جا کر میں سب کپڑے تیار کر چھینک ڈونگا اور جب میں نے اپنی فوٹ بک میں کچھ اندراج کیا تو اسے یہ معلوم کر کے بہت تعجب ہوا کہ ہندوستانی لکھنا پڑنا بھی جانتے ہیں۔“

لیکن ہم عہدِ قن اشتیاق اس عجائب گھر کے دروازے پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج بند رہے گا۔ ہم نے ایک اہلکار سے کہا اے ظالم۔ ہم تو ویانا آئے ہی اس میوزیم کے لئے ہیں کھول اسے! لیکن بے کار۔ اُس نے کہا۔ یہ تو بند ہے اور یہ سامنے والا ہسٹری میوزیم بھی آج بروز منگل بند رہے گا۔ آپ کچھ گیلیری دیکھ لیجئے۔ ہر چند کہ یورپ میں مصوری کے شاہکار دیکھ دیکھ کر ہمارا سینہ آرٹ کے رموز سے بے طرح مفلوج ہوتا تھا تاہم مجبوراً وہاں گئے اور جب گئے تو تصویریں بھی دیکھیں اور کچھ کو پسند بھی کیا۔ خاص طور پر سولہویں صدی کے مشہور مصور برادنگ کی تصویروں کو۔ جیسا کہ میں ہمیں ہر ڈرائیڈ آئے تھے۔ لوسرن میں پنورا ما کا کینوس دیکھ کر ہم مبسوت رہ گئے اور یہاں برادنگ

نے کہ جزئیات کا بادشاہ ہے، ایک چوک کا نقشہ کھینچ رکھا تھا جس میں ہانک لگا کر پھل اور روٹی بیچنے والے، اپاہج، بھک شگے بے فکرے بھی کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ بس

کاغذی ہے پرین ہر سپیکر تصویر کا

لیکن یہ ہم کیا تفصیل سے کر بیٹھ گئے۔ آپ کو اس سے کیا دلچسپی، یہ موضوع تو ہم ایسے فنون لطیفہ کے مبصروں کا ہے۔

وینا سے استنبول اور استنبول میں اُدھ گھنٹہ ٹیکسی لے کر قاہرہ۔ سٹھ مینیٹ نشستوں کے لئے ایل ایم جہاز میں ہم کل پانچ آدمی تھے۔ قاہرہ کے ہوائی اڈے پر شام کے پونے نو بجے اترے تو دواں قلی تو بے شمار تھے۔ کسی مسافر کا نام و نشان تک نہ تھا۔ کسٹم والوں نے اور پاسپورٹ والوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ پوچھ گچھ کیا معنی اُن کا بس چلتا تو ہمارے گلے میں مار ڈالتے۔ بنک کے ایس پیجی کونٹر پر ہم نے بے نیازی سے پانچ پونڈ کا نوٹ پھینکا اور کہا فی الحال ایک پونڈ کے مصری سکے دے دو۔ خزانچی بولا۔ جناب میرے پاس واپس کرنے کو چار پونڈ کہاں ہیں؟ آخر ہم نے بٹوے کی خوب سی جیب تلاشی لے کر دو ڈالر برآمد کئے۔ ایک اور پاکستانی مسافر سید آفتاب احمد گنڈا سے آتے ہوئے دو دن کو یہاں اترے تھے۔ انھوں نے ایک ڈالر مجھنا یا باقی مسافر شاید مصری تھے۔

یا تو یورپ میں یہ عالم تھا کہ ہم اپنے سامان کے چاروں ٹک خود اٹھا کر بس تک لائے تھے۔ کیونکہ ہونڈی کانگریس میں دس فیصد سروس چارج تو ضرور لے جاتے تھے لیکن ڈربان

یا حمالی قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ یا یہاں دیکھا کہ پانچ آدمی صرف ہمارے سامان کے لئے
پکے۔ ایک سوٹ کپڑے ایک نے اٹھایا۔ دوسرا دوسرے نے۔ تیسرے نے ہمارے شیو
کے سامان کا قیڑھا اٹھا۔ چوتھے نے ہمارے ہاتھ سے ہمارا بریف کیس چھین لیا۔ اب ہمارے
پاس فقط لندن ٹائمز کا اس روز کا پرچہ رہ گیا تھا، سوئس سے پانچویں آدمی نے لے لیا۔ اور
سلام کیا کہ ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔ اور پھر ان بھلے مانسوں نے آدمی دھستے
میں یعنی ہماری کار سے کوئی دس گز کے فاصلے پر ان چیزوں کو رکھ دیا۔ وہاں سے دوسرے
آدمیوں کی ڈیوٹی شروع ہو جاتی تھی، وہاں ہم نے صرف تین آدمیوں کی خدمات حاصل کیں
چوتھے کو کوئی سامان نہ ملا۔ تو اس نے دھڑکہ ہماری کار کا دروازہ کھولا اور تیسری نکال دی۔
ہمارے جی کو قاہرہ پہنچ کر عجب علانیت سی محسوس ہوئی جیسے اپنے گھر آ گئے ہوں، تو
دوڑ گئے ہوں گے کہ ایک بستی سے اذان کی آواز آئی جس سے ہماری آنکھوں میں آنسو سے
آ گئے۔ یہ کار یونیٹ کو کے دفتر نے ہمارے لئے بھیجی تھی لیکن ہمارے ہم سفر پاکستانی کو جس دست
کے ان ٹھکانہ تھا وہ انہیں لینے نہ آئے تھے لہذا ہم نے کہا بیٹھے پہلے آپ کو شریف پاشا
الکیر میں پہنچا دوں۔ جہیں ہوئی پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا کیونکہ ہم
ان کو چھ دنوں کا سفر لیتے تو اصل قاہرہ سے دور رہتے۔ ٹخنوں تک پہنچتے ہوئے لائے
چوڑے۔ سر پہ نچے کھڑکڑاتی بیس اور ڈرائیو جی، کباجی، حلوائی، نانائی، کھجے، بچے بولے
شور بہ فروش، گھیسوں کے کونے کے چائے خانوں میں گپ مارتے تماشہ کھیتے۔ نزدیکی
پہنچتے ہوئے لوگ۔ ٹریفک سٹائل کی لال روشنیوں کو دھتکتا جاتے ہوئے ایک بڑھیا بازار
میں اپنا گدھا لئے کھڑی تھی اس پر سگڑے لدے تھے۔ بچے ننگے پاؤں ننگے مردھا میرا
جہاں پہنچے آنکھ پھولی کھیلنے ہوئے.....

تو گویا یہ تھا کہ ہر وہ بھول گارڈن سٹی میں کمرہ نمبر ۴۲ کا دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے کھولنا تو عین سامنے دریا تے نیل لہراتا نظر آیا۔ ہمارا دیکھ چکے ہیں قصر انبیل یعنی دریائے نیل کے بڑے نیل پر کھلتا ہے۔ ہم نے اوپر کوٹ اتارا اور اسے تہ کر کے سوٹ کیس میں سامنے کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔ تو نے انگلستان سے آسٹریا تک ہماری خدمت کی ہے۔ اب آرام کر ہم بھی تو تجھے اپنے کاندھے پر اٹھائے پھرے ہیں، جان سے لگائے رہے ہیں جیب میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ جو رقم ہوائی اڈے پر بھجوائی تھی۔ قریب قریب ماری مزدوری اور بخشش میں ٹھکانے لگ چکی۔ نیچے بھول کے کونٹر پر جس عظیم شیم میرے یا دربان نے ہمیں اہلا و سہلا کہا تھا وہ بھی کم از کم پانچ پیاسٹر کا حق دار تھا۔ لیکن جب ہم نے پچیس پیاسٹر کا نوٹ اسے دیا کہ اس کی ریز گار رہی ہیں وہ تو اس کے پاس سے مشکل آٹھ نو پیاسٹر نکلتے۔ باقی کے عوض اس نے ایک زمانے کا سلام اور تھینک یو مجھے حوالے کئے۔ لیکن اب ہم مشرق میں تھے اپنے گھر میں تھے، شراب پینے اور سو کر کھانے والے کافروں سے دور۔ ہمارا جی بہت ہلکا اور کشادہ ہو رہا تھا، بالکنی میں نخل کر بیت کی کر سی پر بیٹھے اور ایک لبا سانس لیا۔ اتنے میں ایک دستک دروازے پر ہوئی۔ یہ کوئی دوسرا چوڑا پوش بھرا تھا۔ بولا جناب بیڑ لاؤں۔ ہم نے کہا۔ نہیں بلکہ معاف کرو۔ بولا دھکی بھی ہے۔

ہم نے کہا۔ ہشت، اور وہ اپنی جالہراتا ہوا بھاگا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے ایک کاغذ چپکا ہوا دیکھا جس پر بھول کے ریٹ لکھے تھے :-

نامشتہ	۱۵۔ پیاسٹر	پنچ	۴۵ پیاسٹر
سینڈوچ پنیر کے	۵۔ پیاسٹر	سینڈوچ سوز کے	۸ پیاسٹر

ہم شگ انٹھانے کو تھے کہ سرایا آیا۔ کیا جب ہمارے ملک کے ان بوٹلوں میں بھی جو ٹورسٹوں کے لئے ہوتے ہیں اس قسم کا التزام ہو۔

ہمارا قاعدہ ہے کہ کسی بھی وقت پہنچیں۔ ایک چکر ہوٹل کے گرد و نواح کا ضرور کرتے ہیں اور چونکہ انسان ہیں پہوپاتے نہیں ہیں، راستہ بھولتے بھی ضرور ہیں اور کبھی کبھی تو ایسا کہ ٹیکسی والا بھی مشکل سے تلاش کر پاتا ہے اور عین اس روز ہمارے ہوٹل کے آس پاس کے گلی کو چے والوں کا حافطہ ایسا خراب ہو جاتا ہے کہ وہ ہوٹل اور سڑک کا نام سن کر منڈیا ہلا دیتے ہیں اور کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں ہم آتا نہیں۔ رات کے دس ساٹھے دس بجے تھے لیکن ہم نکلے۔ آگے ایک بڑا چوک تھا۔

نام اس کا میدانِ تحریر۔ جی خوش ہوا کہ اس ملک میں لکھنے والوں کی اتنی قدر ہے اس کے مقابلے میں کراچی کو دیکھئے کہ ہمارے نام پر ایک بھی سڑک یا چوک نہیں بلکہ گلی کے سرے پر ہم نے جو ابنِ انشا اسٹریٹ کی تختی اپنے خرچ سے لگائی تھی وہ بھی کارپوریشن والے اتار کر لے گئے۔ ہم یہ افسوس کر رہے تھے کہ ایک آشنا صورت نظر پڑی۔ پروفیسر محمد حسن الاعظمی جا رہے تھے۔ ہم نے کہا حضرت آپ کہاں؟ برٹسے خلوص سے سلام دُعا ہوئی اور باتوں باتوں میں انھوں نے بتایا کہ یہاں اہل علم کی قدر تو ہے لیکن میدانِ تحریر کا مطلب ہے بریشن سکوائر۔ تحریر کا لفظ حریت کا رشتہ دار ہے۔ ہم نے کہا پھر محرر۔ چنگی محرر وغیرہ کا بھی یہی مطلب ہوا کہ اپنے عمل میں آزاد ہیں جس سے جو چاہیں وصول کریں۔ فرمایا۔ وہ بات اپنے ہاں کی ہے۔ وہ تو یہ وضاحت کر کے چلتے بنے لیکن ہم چوک کی روشنیوں میں آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔ اس چوک سے

کوئی چورہ پندرہ رستے پھٹتے ہیں اور جس اونچی بلڈنگ کو ہم نے نشانی مقرر کیا تھا
وہی جہیں دس بلڈنگیں نظر آئیں۔

ہم نے اپنی سڑک کا نام تک یاد نہ کیا تھا کہ دُور تھوڑا ہی جا رہے ہیں۔ ہٹلر
کا نام بتا کر پوچھا تو سب نے کہا۔ یہ نام تو ہم نے آج ہی سنا ہے۔ کہاں ہے، کس
طرف کو ہے؟ کہہ رہے؟ آخر ہم نے کہا لوگو۔ جہیں دریائے نیل پر پہنچاؤ۔ آگے
ہم جانیں ہمارا کام۔ نیل پر پہنچے۔ وہاں سے نیل کے پل پر پہنچے۔ مشکل یہ ہے کہ ہماری
کھڑکی سے تو نیل نظر آتا تھا لیکن نیل سے ہماری کھڑکی نظر نہ آتی تھی۔ آخر ایک ٹیکسی
ڈرائیور نے ہماری مشکل حل کی اور دروازہ کھول کر کہا۔ اندر بیٹھئے۔ ہم بیٹھے۔ لیکن
ٹیکسی دس قدم جا کر یک لخت رُک گئی۔ ہم نے کہا یا اتھی! پٹرول ڈلو کر چلا کرو۔
یوں مسافروں کو راستے میں نہیں رکھا کرتے۔“ بولا بھی پٹرول تو بہت ہے لیکن آپ
کا ہوئی آگاہ ہے۔

ہم نے کہا۔ یہ بات تھی تو تم انگلی کے اشارے سے بتا دیتے۔ بولا بھی انگلی
سے اشارہ کرنا یہاں بد تمیزی سمجھا جاتا ہے اور پھر ٹیکسیاں کاہے کے لئے ہیں؟
آپ لوگوں کی خدمت کے لئے ہی تو ہیں۔ سات پیاسٹر؟

اہرام کے سایے میں

ہر شام جب ہم اپنی بالکنی میں سے نیل کے اس پار اور اُس پار قہرہ کی روشنیوں کا سیلاب دیکھتے ہیں تو یادوں کے غلغلات میں سے کچھ چہرے ابھرنے لگتے ہیں۔ ان روشنیوں میں شاید وہ چراغ بھی شامل ہیں جن کے بغیر پاکستان کے بے شمار گھروں میں درد کا اندھیرا ہے۔ حمید ہاشمی کا شریر چہرہ۔ خاقان قریشی کی مہربان مسکراہٹ۔ ابو صلح اصلاحی پان لکھتے بیٹھے کہتے۔ جعفر منصور۔ چلباہٹ کا بتا دیا۔ ایم۔ بی خالد۔ زندگی کے غنائم سے بھر پور اور خالد ضیا لودھی جس کے گھر سے ہمارے گھر کی دیوار ٹی تھی.... یہ سب لوگ پلی آئی اے کے پیارے سے چلتے تھے لیکن پنچے نہیں.... اے دوستو!۔ اے دوستو!

اور ابوالمول کی زبانی ہم نے آج شام کے جھٹ پٹے میں یہ بنکار سنی کہ میں لازوال ہوں۔ دنیا موت سے ڈرتی ہے اور موت مجھ سے ڈرتی ہے۔ میں اور خوف کا یہ ہریم اعظم رہتی دنیا تک کھڑے رہیں گے۔ ابوالمول کو نہ اپنی ناک نظر آتی ہے نہ ہریم اعظم کا اکھڑا



ہوا پسترنہ خوف کے تابوت کا خالی طرف۔ شگ و خشت اگر قائم بھی ہیں تو سنگ و خشت میں دھرا جی کیا ہے جو موت اور ہر توجہ کرے۔ کبھی خزاں نے پاشنگ کے پھولوں کو بھی تاکا ہے۔ اسے تو تازہ اور شاداب گل پسند آتے ہیں۔ پتھر باقی ہیں اور ریت باقی ہے لیکن توت عنخ آمون — ملکہ نفرتیتی — حسن کے تاجدار کہاں ہیں۔ عشق کے جانثار کہاں ہیں۔ جہاں بیٹھے ہم ابوالمول کی بنکار سن رہے تھے۔ عین وہاں کھڑے ہو کر انطنی اور کھوپڑا نے اہرام اور ابوالمول کو دیکھا ہوگا۔ یہیں سے ہیرودوش نے ان پر نظر ڈالی ہوگی۔ یہیں سکندر اعظم کے دندانے تدم پڑے ہوں گے قبض کا شہر لبا اور اجڑا — اور کل میں پولین بونا پارٹ کھڑا تھا — یہ ریت اور ریت پر جنتے ہوئے مٹتے ہوئے قدموں کے نشان ناموروں کے — ہم ایسے بے ناموں کے —

شب کے اندھیرے میں اپنے آس پاس کی فضا کو ہم نے سرواہوں سے بوجھل پایا۔ بسکیاں بھرتے سنا اور ابو الہول برابر ہنکار رہا تھا..... میں لازوال ہوں میں لازوال ہوں..... ایک ایک سامنے دیوار پر ایک سایہ نووار ہوا۔ غور سے دیکھا تو ایک کتے کو پایا جو کھنڈروں میں جانے کہاں سے نکل آیا تھا۔ اس نے ٹانگ اٹھائی، ابو الہول کے منہ کی ابدیت پر پشیماب کیا اور ایک طرف کو نکل گیا۔ اپنی سال و دو سال کی زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لئے۔

روشنی اور آواز کا یہ پروگرام قریب قریب ہر شام کو ابو الہول کے مجھے کے سامنے ہوتا ہے۔ چھپی ہوئی روشنیاں ایک ایک کر کے اہرام اور ابو الہول کے پہلوؤں کو اجاگراتی ہیں اور پس منظر سے کمٹری ہوتی ہے۔ ایک آواز — پھر دو مصری آواز۔ پتھر گھسیٹ کر لٹنے والے ہزاروں بے نام بے گاری مزدوروں کا شور سناؤ دیتا ہے۔ سامنے مصری دیوتاؤں کے مندروں میں آتی اترتی ہے۔ نئے فرعون کی تاج پوشی کا جشن ہوتا ہے۔ بابے گا بے بچتے ہیں اور اس کے بعد اس کی میت اٹھتی ہے اور باقی نغمہ فضا میں پھیل جاتا ہے۔ لکھ نغمہ تپتی کا نغمہ گونجتا ہے۔ کاہن کی بھاری مہر کم آواز سنائی دیتی ہے۔ صدیاں جاگتی ہیں اور بھاری گھڑیوں کے دقیقوں اور ساعتوں کی طرح گزر جاتی ہیں۔ تاریخ کے پردے اٹھتے ہیں، گرتے ہیں، بٹرتے ہیں، ابھرتے ہیں۔ دریلے نیل بھر رہا ہے، ٹمٹما ہے، کوئٹیں پھوٹتی ہیں اور فضلیں کھٹی ہیں باپ اپنا ہرم بناتا ہے، بیٹا دوسرا ہرم بناتا ہے اور پھر غضب ناک هجوم ان کے تابوت کھول کر ان کی لاشوں اور میموں کو گھسیٹ لے جاتے ہیں۔ ہم نے مصری عہد عتیق کے

عجائب گھر بہت دیکھئے، ہر جگہ دیکھئے۔ لندن میں، جنیوا میں، لائپٹن میں، ویانا میں، ایسٹرم میں، لیکن قاہرہ کے عجائب گھر کے سامنے گرویں۔ یہاں جا کر ان شانِ رفتہ کی عظمت و جبروت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ فرعون خلیفے باسماں لوگ تھے۔ پھر ان کے معمار، مہندس، ستارہ شناس، نقش گر، منشی، خوشنویس۔

نرمن کے سیلاب نے نیچے کی مٹی اور کروی اور اوپر کی مٹی نیچے۔ اس سرزمین پر پھر یونانیوں نے قبضہ کیا۔ دامن اسے اگر روند گئے، عثمانیوں کے لگے شتوں نے حکومت کی۔ انگریز چھاؤنی ڈالے بیٹھے رہے۔ اور آج اسے امراتیلیوں کے غول کا سامنا ہے۔

اہرام ہم نے تنہا جا کر دیکھے، جن صاحب نے ساتھ جانے کا وعدہ کیا تھا وہ ٹال گئے۔ آخر میدانِ تحریر سے آٹھ نمبر کی بس پکڑی اور سامنے جا اترے۔ ایک نرمن میں وہاں کھڑے سے کھڑا پھلتا تھا۔ اب وہاں فقط دو بیاب تھے۔ ایک ہم ایک کوئی جا پانی صاحب زاوے۔ یا پھر اسکول کے لڑکوں کا ایک دستہ بیرونِ قاہرہ سے آیا ہوا تھا۔ اونٹوں والے اپنے اونٹ سے کر بھلی طرف بھاگے۔ گائیڈ بھی دوڑے دوڑے گئے۔ ایک نے ہمیں سب سے پہلے آیا اور نعرہ لگایا۔

”جلیان ویری گڈ۔ انڈیا ویری گڈ“

ہم نے کہا: ہم انڈین نہیں ہیں۔

بولا: پاکستان آسو گڈ۔ کم آن۔

یہ نعرہ اس کا اپنا نہیں تھا۔ وہ اپنے ملک کی پالیسی بیان کر رہا تھا۔

”انڈیا ویری گڈ۔ پاکستان آسو گڈ“



یہ سامنے خوف کا هرم ہے۔ سب سے بڑا۔ اس کی سطح چلنی نہیں ہے۔ جیسی
تصویروں میں نظر آتی ہے۔ ایک کے اوپر ایک تھوڑا ہٹا کر چھروں کا ردوار رکھتے
گئے ہیں۔ بعد میں پستہ کر کے سطح ہموار کر دی گئی ہے۔ لیکن وہ زمانے نے الٹا ڈالا۔
اب تو پاؤں رکھتے ہوئے اوپر جاسکتے ہیں۔ ہم اوپر تو خیر نہیں گئے لیکن اندر پہنچے۔
یہ راستہ جس سے اب اندر جلتے ہیں چوروں نے بنا دکھا ہے۔ چلنے کس زمانے میں
انھوں نے خوف کے مقبرے کے جوہرات اور دولت چرانے کے لئے نقب لگائی ہوگی
اور اس میں کامیاب رہے کیونکہ انجاریوں صدی کے آواخر میں جب چلی فرانسیسی
مہم اندر داخل ہوئی تو انھوں نے تابوت کے ڈھکنے اور لاش کو غائب پایا۔ اس
چور رستے کی انجائی نقطہ اتنی ہے کہ آپ جھک کر قریب قریب گھٹنوں کے بل اندر

جاسکتے ہیں۔ آگے مارے رستے میں خاصی تکیہ چڑھائی ہے اور لکڑی کے تختے بچا کر پاؤں ٹھکانے کو پشتی بان لگا دئے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اور پر خور کے مکروہ تابوت میں پہنچے تو سانس چڑھ گئی تھی اور وہاں تازہ ہوا کو داخل نہیں تھا۔ سخت گرمی جس اور ہوا کی کمی سے ہمیں اپنا دل ڈونتا محسوس ہوا۔ جی چاہا بھاگ کر باہر نکل جائیں آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں لیکن باہر جانا ممکن نہ تھا۔ باہر کا دروازہ ان آدھ فلاں گیس میں میڑھیوں اور سرنگ کے اس پار تھا۔ دوسرے لوگوں کے خیال سے ہم نے آراوہ مضبوط کر کے اپنے قوی اور اپنے سانس کو قابو میں کیا۔ در نہ بے ہوش ہونے میں کسر نہ تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ محتاط لوگ اسی وجہ سے اندر نہیں آتے اور کمزور جسم و جان کے لوگوں کو تو وہاں آنا دیسے ہی منہ ہے۔ ہم کمزور جسم و جان کے نہیں ہیں۔ لیکن غلطی یہ کہ سچ سچ اوپر چڑھنے کی بجائے یک دم تیزی سے اوپر چلے گئے۔ اور سانس پھٹا بیٹھے۔

اس تجربے کے باوجود ہم دوسرے دونوں ہرموں کے اندر بھی جاتے اگر جا پاتے، لیکن شام کا چھٹ پٹا ہو گیا تھا۔ لہذا البواہول کی طرف جا اترے جو نیشب میں ہے اور روشنی اور آواز کا کھیل شروع ہونے تک ہلٹن والوں کے رستوران 'خوفز' میں بیٹھے کافی پیتے، کچھ نہ کچھ کھاتے ٹھونکتے رہے۔ پروگرام کا ٹکٹ خالص ہے تیرہ چودہ روپے لیکن ہے دیکھنے کی چیز۔

ہم نے یہاں دو مصر دیکھے پرانا مصر اور نیا مصر۔ پرانے سے مطلب فرعونوں کا مصر نہیں بلکہ ناصر سے پہلے کا۔ پرانی پود اور نئی پود۔ پرانی نسل چائے خانوں میں

بیٹھی گپ کرتی اور چور سر کھینچتی اور دھوپ تپاتی۔ ہم نے تو لوگوں کو دین کے دس بجے بھی کہ ہر جگہ ہر ملک میں کام کا دقت ہوتا ہے نہیں پٹیتے، تاش کھیتے پاید یورپ میں جہاں پانچ کاموں کے لئے ایک آدمی ہوتا ہے۔ یہاں ایک کام کو پانچ آدمی کرتے ہیں دیکھا کہ چار آدمی سڑک پر جھاڑو دے رہے ہیں۔ پانچواں بیٹی باندھے ان کا داروغہ کھڑا ہے۔ سر بازار کھانے کی چیزوں پر گرد و حول کھیاں بھی کچھ ہیں لوگ نان کو زمین پر رکھ دیتے ہیں اور پھر کھالیتے ہیں۔ ڈھیلے ڈھالے ٹخنوں تک پہنچے جوتے کرتے، منی میں گھسٹتے جا رہے ہیں۔ انہر کے اس پاس یا شریف پاشا الکبر یا میدان عقبہ میں جائے تو سارا ماحول قرون وسطی کا ہے۔ ہمیں الفیلے یاد آتی کہ اس کے کچھ قصوں کا محل قاہرہ بھی ہے کبڑا بونا بھی قاہرہ ہی میں تھا اور بوبک حجام اور اس کے سات بھائیوں کا قصبہ بھی یہیں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ہم نے بھی ایک روز یہاں بال کٹائے لیکن یہ اطمینان کر کے کہ اس شخص کو کوئی ایسی زبان نہ آتی تھی جو ہم سمجھتے ہوں۔ پھر بھی وہ بال کاٹا گیا اور کچھ نہ کچھ قصہ کہتا گیا۔ کوئی کوئی لفظ ہماری سمجھ میں آتا بھی تھا لیکن ہم نے ہونکارا نہ بھرا۔ ہم نے انگلی کی نوک دکھا کر بتایا تھا کہ بس ہمارے بال اتنے سے چھوٹے کرنا۔ زیادہ نہ کاٹ دینا۔ اس نے اتنے کہنے دیئے باقی کاٹ کر ڈھیر کر دیئے۔ ہم نے پھر بھی آف نہ کی اور پیسے دے کر باہر نکل آئے۔ وہ شخص ابنا و سہلا۔ اسرائیل۔ ناصر۔ جہاد وغیرہ کرتا ہوا اگلی کے موڑ تک ہمارے پیچھے آیا۔ بہت خلوص کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

اور پھر دوسرا مصر ہے نوجوانوں کا۔ ان نوجوانوں کا جو کالجوں اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور ناصر کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ تعلیم یہاں مفت ہے اور سب

کے لئے دروازے کھلے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں کو روزگار بھی لازمی طور پر ملتا ہے۔ فوجی تربیت بھی لازمی ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو چھوڑ کر کوئی شخص بھی مشغولی نہیں۔ ڈیڑھ سال تک اسے لازماً ٹریننگ لینی پڑتی ہے۔ دفاتروں میں تیز رفتار لڑکیاں کام سنبھالے ہوئے ہیں۔ کارخانوں میں مزدوروں کو کارخانے کی طرف سے دودھ ملنے کا حکم ہے۔ بڑی جائیدادیں ختم۔ بہت سے پیداواری ذرائع اب حکومت کے ماتھے میں ہیں یا سیاسی پارٹی کی ملکیت یا اداوا بھی کے اداروں کی تحویل میں یہی لوگ نئے مصر کی امید ہیں۔ اس روز صدر ناصر نے پارلیمنٹ میں تقریر کی تو ریڈیو پر بھی نشر ہوئی۔ میدان تحریر میں اور سڑکوں پر اسے سننے کے لئے لوگوں کے ٹھٹھٹ لگے تھے۔

اور صدر ناصر کی تقریر بھی عمدہ۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں شکست نہیں ہوئی شکست اسے کہتے ہیں جسے شکست مان لیا جائے۔ کیا ڈنکرک سے انگریزوں کے نکل جانے سے وہ جنگ عظیم مار گئے؟ لڑائی ہتھیار کی ہتھیار سے نہیں ہوتی بلکہ عزم کی عزم سے ہوتی ہے اور ہمارا عزم ناقابلِ تسخیر ہے جس کوئی ایسا فارمولہ قبول نہیں جو ہمیں اسرائیل کو تسلیم کرنے پر مجبور کرے۔ ہم طاقت جمع کریں گے اور اسرائیل کو عربوں کے علاقے سے نکالیں گے۔ جو چیز طاقت سے چھینی گئی ہے وہ طاقت ہی سے بحال کی جاسکتی ہے۔

صدر ناصر نے ان لوگوں کو بھی دلاکارہ سمجھوں نے ناجائز منافعوں سے جدا کر دیا۔ بنا دلچسپی اور لکھا سب کا محاسبہ ہو گا۔ سب کی مراعات اور استحقاق ختم۔ یہ محاسبہ صدر مملکت یعنی میری ذات سے شروع ہو گا۔

خان خلیل کی ایک شام

یورپ میں ہماری کم خوری اور غم خوری سب کی تلافی سردار انور خاں نے کر دی۔ سردار انور شاہزادہ ہمارے پرانے دوست آج کل قاہرہ میں ہمارے سفارت خانے میں کونسلر ہیں۔ ہمیں خبر نہ تھی کہ یہاں ہیں پچھلی بار بٹے تھے تو برازیل میں تھے۔ اب ملاقات ہوئی تو جیسا کہ پاکستان میں دوستی کے آداب ہیں انہوں نے کہا چل کے کباب کھائیں گے۔ سردار انور خاں کی دعوت میں خوشی خوشی جانے میں ایک نکتہ یہ تھا کہ ہم ان کو اپنی غزلیں سناسکتے تھے۔ سارا یورپ گھوم گئے کسی نے ریماء بھی نہ پوچھا تھا کہ صاحب اپنا کلام غنایت فرمائیے۔ شاعر پر یہ وقت بڑا کڑا ہوتا ہے۔ وہ تین مہینے تک مکہ اور واہ واسبحان اللہ نہ سنے تو اس کی شاعری کا پودا مر جھانے لگتا ہے۔

بولے ”کیا کھاؤ گے؟“

ہم نے کہا ”نکتہ کھائیں گے۔“

بولے ”تکے کو یہاں کباب کہتے ہیں؟“



لاہور دسویں صدی میں

ہم نے کہا: "کیا اب بھی کھائیں گے؟"

ہوئے: "کیا اب کو میاں کو فتنہ کہتے ہیں؟"

ہم نے کہا: "کو فتنہ بھی کھائیں گے؟"

اب وہ چپ ہو گئے۔ کہ ہم نے اس کا مصری نام بتایا تو یہ اس کو بھی کھائیں گے۔ ہم نے بہت پوچھا کہ کو فتنہ کو میاں کیا کہتے ہیں۔ وہ ناں نہی گئے۔

اس شام ہم نے اتنا کھایا کہ پیدل چلنا دشوار تھا۔ وہ ہمیں ہمارے ہوٹل کے دروازے پر چھوڑ کر گئے۔ اس سے پہلے بھی ہم نے کچھ کسرنہ چھوڑی تھی۔ بلکم سجاد حیدر نے ہمیں چائے پر بلایا تھا۔ وہ جنگ پڑھتی ہیں اور ادب کا بھی وسیع مطالعہ رکھتی ہیں۔ سجاد حیدر صاحب (ہمارے میٹر) بھی تشریف رکھتے تھے۔

ان سے ہم نے ذکر کیا کہ ہم بغداد جانے کا عزم رکھتے ہیں۔ فرمایا: وہاں تو جب جاؤ گے سو جاؤ گے۔ وہاں کی مٹھائی یہیں کھلانے دیتے ہیں۔ یہ لویہ من دس لویہ ہم نے کہا: آپ پر یہ کہاں سے اترا ہے۔

ہوئے: "اترا نہیں، ایک صاحب لائے تھے۔"

ہم نے کہا: "ہوائی جاز سے لائے ہیں؟ معلوم ہوا۔ ہاں۔ ہم نے کہا تو پھر اُترا ہی کتنا چاہیے۔"

من سلوی ہم نے مزے میں رکھا۔ اس کی اوپر کی تہہ نرم تھی۔ اندر کی بہت سخت ہم نے کہا۔ من تو ہم کھا سکتے ہیں لیکن یہ اندر سلوا ہے کہ ڈی سلوا۔ یہ ہم سے نہیں چلتا۔ تب بلکم صاحب نے فرمایا: یہ آپ کی قسمت میں نہیں ہے تو یہ ہو سکتے ہیں اور سردار انور خاں کی دعوت میں جانے تک ہم آدمی درجن سو سے

کھا چکے تھے۔

اور اگلے روز عبدالباری انجم نے جہیں کبوتر کھلانے۔

عبدالباری انجم جیسا کہ ان کا نام کہے دیتا ہے۔ شاعر ہیں۔ دس بارہ برس سے قاہرہ میں مقیم ہیں۔ ریڈیو پر چیف ناڈنسر ہیں۔ ہماری آمد کا معلوم ہوا تو ازراہ مہربانی ملنے آئے۔ ہم نے کہا، میاں انجم! اب ہمارا ایک دن باقی ہے۔ تمہاری یونیورسٹی الانہر ہم نے دیکھ لی۔ اہرام کو سلام کر آئے۔ لیکن صلاح الدین ابوبی کا قلعہ نہ دیکھا۔ محمد علی کی مسجد نہ دیکھی۔ کراچی کے لوگ ہم سے باز پرس کریں تو ہم کیا جواب دیں گے۔ اپنا ایک دن ہمارے ساتھ خراب کرو۔ ہم تمہارے شہر بھی نہیں گئے۔

بوسے بازار خاں خیل بھی گئے آپ؟

ہم نے کہا ”ایک بار دیکھا ہے۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ لیکن پہلے قلعہ و مسجد“

اور وہ دن اور وہ شام ہم نے پرانے قاہرہ کی گلیوں میں گزارا۔ غالیوں کے عہد کی مسجدیں مملوکوں کے عہد کی مسجدیں رفیع الشان، پر حیدت اور پھر وہ قلعہ۔ ہاں اسی ڈیوڑھی کی اسی محراب تھے سے صلاح الدین ابوبی اپنے سمند پر سوار گزرتے ہوں گے۔ ان فیصلوں پر ان کے سر شگوں کی نشست ہوئی مقلعے کی شکست۔ دور دوری وارنے افسانے کہنے شروع کئے۔ سلطوب رفتہ کے جلیبیوں سے معرکہ آزادی کے۔ اور نیچے ان کے بھائی کی بنائی ہوئی مسجد ناصرہ کھڑی تھی اور مجھے منقطع کی سپائیاں تھیں اور سارا قاہرہ دور تک نظر آتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک جگہ سے نیل بھی جھلکتا تھا۔

قاہرہ کی پرانی مسجدوں میں سے جامع الازہر اور سیدنا حسینؑ جہاں حسین علیہ السلام کا سر دفن ہونے کی روایت ہے۔ اپنی الگ شان رکھتی ہیں مسجد رفاعی ان سے الگ ہے۔ اس کے صحن میں چار بڑی محرابیں ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں جن میں اسلام کے چاروں مسکوں کے مدرسے تھے لیکن قلعہ ایوبی کے اندر محمد علی کی مسجد باغلی ہتھول کی مسجدوں کے نمونے کی ہے۔

محمد علی پاشا، شاہ فاروق کا پردادا ترک تھا اور عثمانیوں کی طرف سے قاہرہ کا گورنر۔ لیکن پھر خود مختار ہو بیٹھا۔ اس کے خدام بھی ترک تھے اور عربی نہیں جانتا تھا اس مسجد میں استنبول کی مسجدوں کا شکوہ نہیں لیکن نمونہ وہی ہے اور پیچھے اس کا محل۔ یہ محل کوئی بہت رفیع الشان نہیں لیکن اندر سے اچھا خاصا ہے محمد علی پاشا کو مملوک سرداروں کی شورش کا بہت ڈر رہتا تھا۔ کیونکہ جس گدی پر وہ بیٹھا تھا۔ وہ ایک وقت میں انہی کی تھی۔ آخر ایک روز اس نے ان کی دعوت کی۔ ناؤ نوش کا دور چلا۔ ایک طرف شادیانے بچ رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی بلوک سردار کھانا کھا کر ایک ایک کر کے اُتھ دھونے کے کمرے میں جاتے تھے اور پھر واپس نہ آتے تھے کیونکہ وہاں جلا دیمغ لئے کھڑا تھا جو داخل ہوتا تھا۔ اس کا سر قلم ہو جاتا تھا اور کوئی آواز ہوتی بھی تھی تو باجوں اور سازوں کے شور میں دب جاتی تھی۔ تین سو آدمی تیغ کے گھاٹ اترے۔ فقط ایک بچا جو معاملہ بھانپ کر دیوار پچانہ نکلا۔

اور ہم نے وہ ال کمرہ دیکھا جس میں یہ دعوت ہوئی تھی اور وہ کمرہ دیکھا جس میں انہوں نے جام اہل نوش کیا تھا اور محمد علی کا مومی بت صدر میں بیٹھے دیکھا

جس کی دوباشت لمبی سفید داڑھی تھی۔ اور اس کے بیٹے ابراہیم پاشا کا بت دیکھا جس نے نجد میں وہابیوں پرستم ڈھائے تھے اور ان کی بغاوت کو کچلنا تھا اور اور پھر اس کے پوتے شاہ فاروق کو قونڈ نکالے چمٹہ لگاتے کپڑی کے ساحل پر ایک حینڈ سے پھل کرتے دیکھا اور پھر اس کی گناہ موت کی خبر اخبار میں پڑھی۔

بازار خان خلیل جامعہ لازہر اور مسجد سیدنا حسین کے عین سامنے واقع ہے ٹیڑھی ٹیڑھی ٹنگ ٹیوں کا گورکھ دھندلا جو ادھر جمالیہ کی طرف نکل گیا ہے جمالیہ کا تعلق جمال سے نہیں بلکہ حمل یعنی اونٹ سے ہے۔ کیونکہ مصر کی غورتوں میں ہم نے خوبصورتی کا زیادہ رواج نہیں دیکھا۔ یہاں اونٹ اور ان کے حمل اور ان کے غمرے ہوتے تھے۔ اس میں ایک بازار زیورات بنانے والوں کا ہے۔ ایک کسروں اور ٹیٹروں کا ہے۔ کچھ تسیجیں اور مٹی برتن بچنے والوں یعنی نحاس کی سی لگیاں ہیں۔ بچ بچ میں لوگندے یعنی ہوٹل ہیں۔ اس زمانے میں چھتے ہوتے بازار ہوتے تھے۔ قاہرہ، دمشق، اصفہان اور بغداد میں ان کی باقیات اب بھی ہیں۔ خان خلیل میں کچھ عمارتیں کچھ دروازے اور کچھ کڑیاں اس بازار کی نشانی ہیں۔ اب یہاں ٹورسٹ آتے ہیں (عرب میں انہیں سیاح نہیں بلکہ سائح کہا جاتا ہے) اور حسبِ مقدور ٹھٹھتے ہیں۔ جنگ کے بعد سے ان بازاروں میں رونق نہیں رہی۔ ہم ایسا کوئی بے سرو سامان بھی گزرتا ہے تو میں دکاندار پکٹتے ہیں، وکیلیم سر، سو ویز سر۔ میاں انجم کہ سامنے لازہر میں پڑھ کر عالم و فاضل ہوئے ہیں، قیام بھی یہیں رکھتے تھے اس لئے بہت سے دکانداروں سے ان کے اہل سہلا اور توڑاٹ

کے تعلقات ہیں۔ قاہرہ کا علاوہ روزمرہ اہل عرفہ کی زبان سب خوب جانتے ہیں۔ دکانداران کی وساطت سے جیسے ادھار تک دینے پر آمادہ تھے۔ لیکن ہم شخص میں نہ آئے اور بھرے پرے بازاروں سے بیگانہ وار گزر گئے۔ سیدنا حسین سے ادھر کو اس بازار میں داخل ہوں تو ایک پرانے زمانے کا بعدا دہنے ہاتھ کی دوسری دکان میں بیٹھائے گا۔ نسوار فروش ہے۔ اور اس کی کائنات چند رنگ آلود ہے ہیں۔ دنیا قافیہ سے بے نیاز ان ڈبوں کی طرف منہ کیے تسبیح پڑھتا رہتا ہے۔ ہم کچی بار خاص اسے دیکھنے کو ادھر سے گزرے۔ وہاں کسی خریدار کو رکتے نہ دیکھا۔ اس نے ہماری طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ پھر چراغ جلے اور ساری دکانوں پر روشنیاں ہوئیں۔ اس کی دکان پر روشنی بھی نہ ہوئی۔ ہم نے قریب جا کر دیکھا تو انعام یلکہ کے اس کردار کو اسی طرح میلے کپڑوں میں سلفے نظریں ٹپکائے تسبیح کرتے پایا۔

انجم صاحب ہوئے : دیکھ لیا بازار خان خلیل ؟

ہم نے کہا : ہاں۔ اب تو ناخۃ اڑانے بلکہ ناخۃ کھاتے کو بھی چاہتا ہے کیونکہ بھوک لگی ہے :

ہوئے ، ناخۃ تو نہیں : کیونکہ ہمیں گئے۔ ادھر آدھین الازہر کے سامنے ٹرک کی ٹکڑ پر بیٹھیں گے۔ کیونکہ وہ اور بازار کی سیر دیکھو :

اور اس ٹکڑ کی دکان کے سامنے باہر کر سیوں پر بیٹھے کیونکہ کھاتے ہم نے قاہرہ کی آخری جھلیاں دیکھیں کیونکہ اگلی صبح ہماری رخصت کی صبح تھی۔ لوگ بال آتے جاتے ہوئے چلیں کرتے ہوئے ————— وہ ماچیں بیچا ہوا بڈھا جس کی ایک بھی ہنس

ہمارے سامنے تو بکی نہیں۔ وہ شخص جس نے اپنے گدھے پر مویاں بار کئے ہوئے کئی بار اس گلی کے چکر کئے۔ آخری بار تو صرف دو گھپے رہ گئے تھے۔ ایک موٹی حسینہ دکانداروں سے مشغول کرتی اور ہمیں اُٹکھ مارتی 'اپنا لانا بُرا گھسیٹتی چلی گئی۔ اور شب کے سائے گرے ہوتے گئے۔

آپ قاہرہ جائے تو ہماری طرف سے اس بڑھے کو ضرور دیکھئے کہ نسوار کی دکان پر بیٹھا جانے کب سے بیچ کئے جا رہا ہے اور یہاں کیو تر کھانے کو ٹھکی بیٹھے پہچان اس کی یہ ہے کہ یہ بازار کا سب سے موٹا دکاندار ہے 'وہی بھر سائے کرسی ڈالے اپنے بلے کرتے میں بیٹھا ملے گا۔ ہمارے بیٹھے بیٹھے دس پانچ آدمی اور بھی اس کی ٹکڑے ٹکڑے جتنی کہ بعض صنعتِ نازک کے فرد بھی۔ اب ہماری سمجھ میں آیا کہ مصری ایرلائن 'یونائیٹڈ عرب ایرویز کی سیٹوں کی پیٹیاں دوسری ایرلائنوں کی نسبت دگنی دگنی بھی کیوں ہوتی ہیں -

لبنان و شام

۱۹ نومبر تا ۵ دسمبر ۱۹۶۷

بیروت کی باتیں

سادھوؤں، سنتوں اور ولیوں وغیرہ سے ہمیں عقیدت تو ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ ان کے بغیر فالہ بھی نہ توڑ سکیں بلکہ یاروں کو تجھ سے حالی کیا خوش گمانیاں ہیں جیسا کہ ہرٹل ST. GERVAIS یعنی ساں یروے کے بعد ہماری گوشش یہ رہی کہ لاویخی یعنی سیکورم کے بوٹوں میں دیں۔ قاہرہ میں بھی جہاں لوگ اسلامیات کی سند لینے اور کباب تلے کھاتے جاتے ہیں۔ ہمیں اطالوی عیسائیوں کے ایک ہرٹل گارڈن مٹی (جاردن مٹی) میں رہنا پڑا۔ اور سپا گھٹی یعنی اطالوی سوراں کھانی پڑیں۔ بلکہ نہ کھانی پڑیں کیونکہ ہم انھیں چھڑی سے اپنے کانٹے پر رکھتے تو تھے لیکن وہ مزہ تک کاٹا اُن سے پہلے ہی پھسل کر پھر ٹیٹ میں جا رہی تھیں۔ اب یہاں بیروت میں

ہوا یہ کہ ہمیں یہاں پہنچتے ہی ہمارے میزبانوں میں سے ایک نے کہا کہ ساں ہیل ہرٹل میں چلے جاؤ۔ ہم نے کہا ہم آہیل مجھے مار کے قائل نہیں۔ ہمیں تو قاہرہ میں پوزیر محمد حسن الاعظمی نے مشورہ دیا تھا کہ خندق سفندق را الجدید میں جانا، گھر کا سا گرم ملے گا۔

ہم نے پروفیسر صاحب سے کہا کہ اس نکتے پر زور نہ دیجئے۔ ہم ایسے بے شمار ہوٹلوں میں ٹھہر چکے ہیں جہاں گھر کا سا آرام ملتا رہا ہے یعنی دروازے میں چابی نہیں لگتی۔ بستر کی چادر کئی کئی دن نہیں بدلی جاتی۔ کوئی بھرا ہوا آواز پرکان نہیں دھرتا۔ ہمیں تو کوئی اچھا ہوٹل چاہیئے۔ گھر کا سا آرام مطلوب ہوتا تو گھر سے نکلتے ہی کیوں؟ یورپ کیوں آتے؟ لیکن پروفیسر صاحب کی تاکید یہی رہی کہ اسی ہوٹل میں جانا۔ واقعی آرام وہ ہے۔ سب سے بڑا آرام تو یہی ہے کہ سستا ہے۔

پس ہوٹل ساں ہل پر ہم نے اعتراض کیا کہ اس کے نام سے چوپالیوں کی بو آتی ہے۔ ہمیں یہ نکتہ بتانے میں خاصی دیر لگی۔ اور خاصی لغت چنانچی پڑی۔ لیکن پھر کسی نے لکھ کر بتایا کہ ساں ہل نہیں ساں ہل۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے کسی لفظ میں ع یا ق یا ط ظ وغیرہ آجائے تو ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ عربی اور اسلامی چیز ہے اسی لئے پورس کے مقابلے میں ہمارا رجحان سکندر اعظم کی طرف زیادہ رہا۔ سکندر اعظم ہی نہیں۔ ارسطو۔ افلاطون۔ بقراط۔ اعلیوس۔ نیشا غورث وغیرہ کو ہم نے ہمیشہ مسلمان ہی جانا۔ ساں پر تو ہم نے غور نہیں کیا۔ ہل کی ع پر ہم چپ ہو گئے۔ لیکن جب ہم ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا یہ تو سینٹ پال کا ہوٹل ہے یعنی یہاں بھی کلیسا مرے آگے۔ اب بیٹھو اور انجیل کا جاپ کرو۔ ممکن ہے ہم سینے پر صلیب کا نشان بنا کر اس وقت بھی رخصت ہو جاتے۔ ہم ایسے گنہگاروں کا سینٹ پال جیسے برگزیدہ ولیوں سے کیا کام لیکن ایک تو ہم تھکے ہوئے تھے دوسرے عین اس کے احاطے کی دیوار کے ساتھ لائٹ ہاؤس یعنی المنارہ نظر آیا چونکہ ان دونوں ہم تقاضائے بشریت سے بہت کام لے رہے ہیں۔ یعنی

راستہ فوراً بھولتے ہیں۔ اس لئے یہ نشانِ خفیت معلوم ہوا جہازوں کے لئے بنایا گیا ہے لیکن ہمارے بھی کام آسکتا ہے۔ ہمارے نشان کا حکمی علاج بے شک نہیں ہے کیونکہ جن کو ڈوبنا ہے ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں۔ تاہم خیر.....

دمِ تحریر رات کے دس بجے ہیں اور ہم اپنے سوٹ کیس میں اپنی فرنچ زبان کی ڈکشنری ڈسٹنڈر ہے ہیں۔ تاکہ تا تو منہ دھو سکیں تفصیل لکس کے باغ میں جانے کی یہ ہے کہ تھوڑی دیر پہلے ہم نے دیکھا ہمارے کمرے میں تو لیہ کوئی رکھا ہی نہیں گیا۔ صابن ہم اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں لیکن تو لیہ تو سنر ابرز کے ہوٹل





تک میں عاتق تھا۔ خواہ چادر گرہ لاکھا۔ یہاں تو ہم نے کمرہ بھی ایسا لیا تھا جس کے ساتھ اپنا ذاتی غسل خانہ ہے۔ اگرچہ اس میں ٹب نہیں ہے اور شیشہ اتنا اونچا لگا ہے کہ ہم جیسے خالصہ اونچے آدمی کی صرف آنکھیں اس میں نظر آتی ہیں شاید صرف بالوں میں لٹکھا کرنے کے لئے رکھا گیا ہے تاکہ لوگ بیجا طور پر ہارسنگھا میں وقت ضائع نہ کریں۔ ایک نظریہ ہمارا یہ ہے کہ یہ کمرہ واٹرچی والے پاوروں کے لیے بنایا گیا ہے۔ ہم ایسے واٹرچی مونڈنے والوں کے لئے نہیں۔ خیر صبح سٹول پر کھڑے ہو کر شیو کر لیں گے یا دل کے آئینے میں خود کو دیکھ لیں گے۔

ہم اطمینان سے کپڑے اتارے بیٹھے تھے تو یہ کہ لئے ٹیلی فون اٹھایا تو نیچے سے عربی سنائی دی۔ آخر پتلون پہنی کوٹ پہنا۔ جوتا پہنا۔ نمائی لگائی اور نیچے ہوٹل کے دفتر میں گئے۔ ہم نے کہا۔ تو یہ چاہیے مبادل۔
 دہاں جڑ لاکھا۔ بس بیٹھا رہا۔ بولا تو عربی بولا۔

بروت میں عربی چلتی ہے اور فرنج۔ عربی ہماری مذہبی زبان ہے اسے ہم دنیاوی کاموں میں لانا پسند نہیں کرتے اور فرنج بے شک ہم بہت سی جانتے ہیں لیکن جس طرح اپنے کاغذات کو اپنے تھیلے میں اور کپڑوں کو سوٹ کیس میں رکھتے ہیں اس طرح اپنی فرنج کی بیات کو بھی ہم نے اپنی ڈکٹری اور فرنج بول چال کی کتاب میں رکھ چھوڑا ہے۔ تاکہ ذہن میں مختلف زبانوں کا جھوم نہ ہو جائے اور مزید علم کے لئے اس میں گنجائش رہے۔ ہم نے لڑکے کو اشارے سے ہاتھ دھو کر دکھاتے۔ اس پر وہ صابن کی ایک ٹیکہ نکال لایا۔ ہم نے کہا یہ نہیں۔ اور خیالی تولیہ سے اپنا جسم رگڑ کر دکھایا۔ شاید وہ ہمیں ورزش کا شوقین سمجھا۔ کیونکہ ہماری کھول کر ڈھیلوں کی ایک جوڑی نکال کر رکھ دی۔ مایوس ہو کر ہم اوپر اپنے کمرے میں آتے۔ تھوڑی تلاش سے جرمن ڈکٹرنری مل گئی اور اس میں تولیے کے لئے HAND TUCH کا لفظ بھی نوٹ کر کے لے گئے کہ جرمنی آخر فرائض کا جسیا ہے۔ لیکن بے کار۔ اگر فرنج ڈکٹرنری نہ ملے۔ شاید کہیں پولینڈ یا مصر میں ہم بھول آئے ہوں تو ہمارا حال قرون وسطیٰ کے پارہیوں اور عیسائیوں کا سا ہو گا کہ نہانے دھونے کو مسلمانوں کی بدعت جانتے تھے جسم سے پسینے کی بو آتی تھی تو بس پوڈر چھڑک لیتے تھے۔ کل بازار جائیں گے تو یا تو تولیہ خرید لائیں گے یا پوڈر کا ڈبہ۔ ان میں سے جو بھی چیز سستی ملی۔

کل رات اوپر کی سطریں لکھنے کے بعد ہم نیچے گئے تو آخر دفتر میں مونچھوں والے ایک پہلوان مل گئے جو شاید ہوٹل کے منہجر ہیں۔ تولیے کے ذکر پر لڑکے سے بولے۔

”اے جاہلہ! کے تولیہ دے صاحب کو“

وہ مسکراتا ہوا گیا اور کسی شے کے میں سے ایک دو مال سا نکال لایا۔ ہم نے کہا اس سے تو ہم ایک کھ پونچھ لیں گے دوسرے کا کیا کریں گے۔ اس پر ایک اور ڈال غایت ہوا۔ ہم نے شکریہ ادا کر کے اور پاؤں پھیلاتے اور کہا ہمیں گرم پانی بھی چاہئے شیو کرنے کو اور بندہ بشر ہے۔ کبھی نہانے کو بھی جی چاہتا ہے۔ خصوصاً جبکہ غسل خانہ کمرے کے ساتھ لگا ہو۔ اس نے کہا اس قسم کی ہر وقت گرم پانی ہٹنے کی عیاشی تو وطن وغیرہ میں ہوتی ہے۔ ہم تو صبح ساڑھے سات بجے کے بعد گرم پانی ٹی میں چھوڑتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ اچھا! آپ کی بڑی مہربانی، لیکن دیکھئے چھوڑتے گا ضرور۔ صبح آنکھ تو ہماری جلد کھل گئی لیکن بیٹے ساڑھے سات بجنے کا انتظار کرتے رہے۔ لیٹاں ہیں اب گرمی نہیں ہے۔ ہم اپنا مٹا سوٹ نہ پہنیں تو سردی لگتی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے یہ لوگ ابھی تک ہمارے کمرے کے نموں کی ٹنگی میں برف کی سل ڈالتے ہیں۔ ہم نے ساڑھے سات بجے ٹی کھولا اور کھولے رکھا۔ کچھ فرق نہ پایا۔ آٹھ بجے کے قریب معلوم ہوتا ہے ان لوگوں نے برف نکالی اور اب خالی ٹھنڈا پانی رہ گیا۔ لیکن ہم نہانے پر تے ہوئے تھے نہلے رہے۔

اور یہ بھی ہم عرض کر دیں کہ شیخ توحید کے پروانے ہونے کے باوجود یہ باقی ماندہ دن غالباً ہم ہوٹل سینٹ پال میں گزاریں گے کیونکہ آج دوپہر مسلمانوں کے ہوٹل فندق سقنقور الجدید ہوا تھے ہیں۔ یہ یہاں کے ڈاؤن ناؤن ماحۃ الشدائیں واقع ہے۔ ڈھونڈنے میں خاصی دیر لگی کیونکہ ہر مکان کی ہر منزل پر ایک نئے ہوٹل کا بورڈ ہے وہاں لی مارکیٹ کے نواح کا نقشہ نظر آیا۔ اتنی گڈنگ تو ہم برداشت کر لیتے ہیں۔

جتنی پاکستان میں ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ کی عادت نہیں غسل خانے کے کمرے کے ساتھ ہونے کی بات تو دور رہی۔ وہ تو دو مسافروں کو ایک کمرے میں رکھتے ہیں تاکہ باہم محبت بڑھے۔ قدرِ عاقبت معلوم کر کے ان کا کارڈ لے کر ہم آگئے لکھا ہے "یتوفر فیہ للمساوکل اسباب الراحة نظافة خارقہ معاملت جیدة۔ حمامات ضمن العزف باسعار لائز احم۔" ہماری سمجھ میں اس میں سے فقط اسباب۔ راحت اور حمام وغیرہ کے لفظ آئے یعنی وہ چیزیں جو ہم نے وہاں نہ پائیں۔

یہاں مشرق وسطیٰ میں ایک چیز البتہ ہم نے ایسی پائی کہ ہمارا وطن واپس جانے کا اشتیاق کمزور پڑ گیا ہے۔ قاہرہ اور بیروت کے لوگ جو ہر شناس ہیں ہر جگہ ہمارا تعارف السید ابن انشا کے نام سے ہوا۔ ہمارے ملک میں ذات پات کو لوگوں نے بوروٹی جاگیر بنا رکھا ہے اگر آپ سید پیدا ہوئے ہیں تو آپ کو سید مانیں گے ورنہ نہیں۔ اچھے بھلے لوگ عمر بھر موچی کے موچی رہتے ہیں۔ ہم عالم عرب سے اپنے سید ہونے کی بہت سی سذات اپنے ساتھ لارے ہیں کیونکہ منصفی کی جائے تو زیادہ مستند ان لوگوں کا فرمایا ہوا ہے۔ سادات کا آغاز ادھر کید عرب ہی میں ہوا تھا۔ ہندوستان پاکستان کے لوگوں کو اس قسم کا حکم لگانے کا کوئی حق نہیں۔ انجن سادات امر وہ اور ذلیفہ المؤمنین وغیرہ کو چاہیے کہ ہمارے نام کی ممبری کی پرچی کا رکھیں ورنہ ہم آکر فساد چاہیں گے۔ استغاثہ کریں گے اپنے ایسے تمام سیدوں کو اپنے ساتھ لائیں گے پاکستان میں ان کی تعداد موروثی سیدوں سے کم نہیں ہے۔

دشقی میں عشق

پہلی رمضان کی افطار ہمیں طرابلس اشام میں صلیبیوں کے قلعے اور مسجد خالد بن ولید کے آس پاس ہوئی اور دوسری رمضان کے چاند نے ہمیں دمشق کی تنگ تاریک محرابی پھتوں والی گلیوں میں گھومتے پایا۔

یہ دن اقوار کا تھا اور بیروت میں بارش ہو رہی تھی۔ اپنی طرف سے تو ہم نے بہت جلدی کی۔ لیکن ساحرہ البرج کے ٹیکسی والے کے لئے پہلی سواری ہم تھے اور باقی چار کی تلاش میں وہ ہمیں غم دے رہا تھا کہ بس پانچ منٹ میں چلتے ہیں۔ اس تاخیر پر ہم نے جو غصہ امارادہ انگریزی میں تھا۔ ہمارے جی کا غبار کچھ دھوا اور ٹیکسی والا بے مزہ بھی نہ ہوا کیونکہ وہ یہ زبان نہ جانتا تھا۔ ہم نے کئی بار ٹکٹ واپس کرنے کی کوشش کی کہ کسی دوسری ٹیکسی میں چلے جائیں لیکن یہی زبان کی وقت حائل رہی۔ ناچار ٹیکسی والے کے ساتھ ہم نے بھی مسافر ڈھونڈنے شروع کر دیئے کسی شخص کو آتا دیکھتے تو آواز لگاتے 'دمشق'، 'دمشق'، 'دمشق'، 'دمشق'، 'اے بھائی دمشق'، 'اے میاں دمشق' چلو گے؟ ایک سواری دمشق کی؟ وہ سر ہلا کر آگے بڑھ جاتا ہمیں سخت

جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی کہ دمشق اتنی اچھی جگہ ہے۔ یہ لوگ جاتے کیوں نہیں۔
 یہاں کیوں گھوم رہے ہیں۔ ہم دوبارہ اپنی انگریزی کی دھارتیز کر رہے تھے کہ
 تین عورتیں بظاہر بارشش سے بچنے کے لئے سائبان کے نیچے آکھڑی ہوئیں
 ایک موٹی اور خاصی عمر کی۔ دوسری جوان، گود میں بچہ اور تیسری ایک لڑکی جسے
 دیکھتے ہی ہم نے فوراً حضرت شیخ سعدی سے کہ ہمارے غائبانہ پیر وہی ہیں
 فرمائش کی کہ یہ ہماری ہم سفر ہو اور لالچ بھی دیا کہ آپ کے نام کی پانچ پیسے کی
 ریوٹیاں بانٹیں گے۔ ہم ایسے مستجاب الدعوات کبھی بھی نہ تھے۔ بلکہ ہمارے معاملے
 میں دجا کو اثر کے ساتھ اکثر دشمنی رہی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے اس وقت باب
 رحمت غلطی سے کھل رہی تھی۔ یا حضرت سعدی ریوٹریوں کے پھیر میں آگئے۔ اس
 لڑکی نے کہا: ”تین ٹکٹ دمشق کے“

یا تو ہمیں ایک لفظ عربی کا نہ آتا تھا یا پھر زبان ایسی رواں ہوئی کہ ہم راستے
 بھر یعنی دمشق تک مس فریاں الدنی سے عربی میں باتیں کرتے گئے۔ اس کو انگریز
 کے صرف دو لفظ آتے تھے: ”دیر ہی ناس“ (بہت عمدہ) چنانچہ ہماری عربی پر
 بھی انھوں نے یہی برتے۔ بھلا ہوا مولوی محمد حسن کا۔ اگر زندہ ہیں تو اللہ ان کو
 فوج کی عمر عطا کرے۔ ورنہ کم از کم اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ عربی پڑھاتے
 ہوتے ہیں چودہ کے چودہ خیفے ایک سانس میں دہرانے پر مجبور کرتے تھے۔ آج
 وہ کام آئے اور چند الفاظ عربی کے۔ نا۔ نعم۔ اجل۔ جائز۔ فی۔ عن۔ شکراً۔ طیب
 وغیرہ نے بھی بڑی مدد دی۔ یہ شامی لڑکی تھی۔ یہ بادام سی آنکھیں اور یہ سیب کے

سے گلابی گال بقیں موٹے موٹے تھے۔ لیکن دلاویز اور صحت مند اور مسکرا سٹ اور شیریں آواز تو ان نعوش میں عجب رنگ بھردیتی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ نیچے والی میری اخت ہے یعنی بہن۔ ہم نے کہا اور یہ بڑھیا تمہاری ماں ہوگی۔ بولیں۔ نہیں یہ میری خالہ ہیں۔ آگے چل کر ٹیکسی کو ایک گلی میں ٹھہرایا تو ایک شخص جس کے چہرے پر خوشونت اور مونچھوں کی فراوانی تھی سوار ہوا۔ یہ مس فرمال کا بہنوئی تھا۔ اس کو دیکھ کر ہماری رطب اللسانی میں تھوڑا سا فرق ضرور پڑا۔ لیکن ہم نے ہمتیار نہ ڈالے۔ مس فرمال دمشق میں طالب علمی کرتی تھیں۔ ہم نے کہا۔ ہم بھی طالب علمی کرتے ہیں اور کاتب ہیں۔ کاتب حضرات بُرا نہ مائن کہ ہم خوشنویسی در اور غلط نویسی سیکھے بغیر ان کی صفوں میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ عربی میں کاتب ادیب کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ ہم ایسا بدخط اور شکستہ خط ہی کیوں نہ ہو۔ عربی بولتا پا کر ان کی خالہ بھی عربی کے ٹکے لگانے لگیں۔ لیکن ہم نے ان پر کچھ اعتنائے کی زبانِ حال سے کہا تو یہی کہا کہ چپ رہو بڑی بی۔ ہمیں اتنی عربی نہیں آتی اور جو آتی ہے وہ فرمال بانو کے لئے ہے۔ ہم فقط ماہِ رخوں کے لئے مصوری سیکھنے والے لوگ ہیں۔

بیردت سے بچنے کے گھنڈ بھر بعد جبل لبنان کی چڑھائی شروع ہو گئی اور پھر تو ہم اوپر تھے اور بادل نیچے وادی میں۔ سردی بھی شروع ہو گئی تھی۔ شطورہ نامی قصبے میں ٹیکسی رکی اور یہ لوگ کہ روزہ رکھے ہوئے تھے کھانے پینے کی چیزیں پھل پھلاری وغیرہ خریدنے کے لئے رکے۔ فرمال نے ہم سے کہا۔ آپ کچھ نہ کھائیں گے۔ ہم نے کہا۔ نہیں۔ بولیں روزہ ہے؟ ہم نے کہا، ہم سفر

میں ہیں، روزہ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں ہم بھی نکل کر دکان پر چلے گئے اور اپنے لئے کچھ سیب پسند کئے اور پیسے دینے کو جیب میں اتھوڑا تو اس بازو نے روک دیا کہ پیسے ہم دیں گے۔ ہم نے کہا اے جان قیس! تو چاہے تو ہمیں بے دام خرید سکتی ہے۔ پیسوں کا تکلف نہ کر۔ لیکن نہیں۔ جیسے یہ سیب قبول کرنے پڑے۔

فرمال کی نشست ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ ہم تو پیچھے کھڑکی کے ساتھ بیٹھے تھے ان کی بڑھیا خالد کے سایہ عاطفت میں۔ فرمال آگے کی سیٹ پر ہمارے بالقابل اس کے ساتھ اس کا تعصاب نما بنوئی اور پھر ڈرائیور۔ لیکن وہ ریل کی ایسی تھی کہ سارا وقت پیچھے کو منہ کئے بیٹھی رہی۔ بات بے بات اس علامت اور اپنائیت سے دیکھ لیتی تھی کہ بس۔

بولیں : کے روز رہو گے دمشق میں ؟

ہم نے کہا : اے دختر شام! ہم مسافر ہیں۔ آج رات چلے جائیں گے واپس۔ یا زیادہ سے زیادہ کل۔ کیونکہ اب ہماری واپسی کا دن قریب آ رہا ہے۔ ہمارا دامن خیال مت پکڑ۔ اس قسم کی دلبری کا کچھ فائدہ نہیں۔ لیکن وہ اس پر مصر رہی کہ دمشق سے آج مت جانا۔ کم از کم دو دن رہنا۔ ہم نے کہا۔ اچھا جو حکم اس کے پاس اس کی تصویریں تھیں۔ ہم نے ایک مانگی تو اس نے اپنے بنوئی کی طرف آنکھ کا اشارہ کیا کہ اس سے خبردار۔

اور پھر دمشق آگیا۔ جہاں یاروں نے عشق فراوانی کر دیا تھا۔ محض اس لئے کہ ٹوڑا قحط سالی ہو گئی تھی۔

ہم دمشق کے چوک میں ٹیکسی سے اترے ہی تھے کہ ایک شخص بھاگا بھاگا آیا — بغداد؟ بغداد؟

ہم نے کہا: "میاں ہم تو ابھی دمشق آئے ہیں تو ہمیں بغداد کیوں دھکیل رہا ہے۔" وہ دھرا کیا ہے۔ بھڑا بکر کے اور اردو کے۔
بولتا: زیارت؟

ہم نے کہا: "لا۔ یعنی اگر زیارت کرنی ہے تو تیری ضرورت نہیں۔
ہاں ہمیں فندق عدن کا پتہ بتا دے۔"

فندق عدن کا نام ہمیں پروفیسر حسن الاعظمی صاحب نے قاہرہ میں دیا تھا اور اس کے مالک ایک سیالکوٹی ہیں۔ مدت سے یہاں مقیم ہیں۔ لہذا عبداللہ ہندی کہلاتے ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ رات رہنی پڑی تو ان کے فندق میں رہیں گے۔ ورنہ دعا سلام تو کریں گے ہی۔ ان سے زیارت گاہوں کا پتہ مقام وغیرہ پوچھیں گے۔
اس شخص نے کہ نام تو اس کا سیلمان تھا لیکن شکل اس کی بڑبڑ کی تھی ہم سے
کہا: "فندق عدن؟ اچھا میں بتاتا ہوں۔"

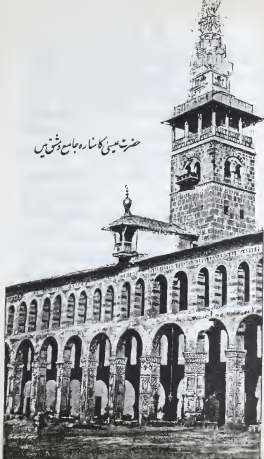
ہمارا خیال تھا وہ انگلی سے اشارہ کر کے بتا دے گا یا چند قدم چل کر ہماری رہنمائی کر دے گا۔ اور ہم شکرا کہہ کر آگے چل دیں گے۔ لیکن اس نے ہمیں آگے
پہننے کا موقع ہی نہ دیا۔ ہم کافی تیز چلنے بلکہ بھاگنے والے آدمی ہیں لیکن وہ تو
بڑبڑ کی طرح چھدکتا ہوا چلتا تھا۔ چوک پار کر کے ایک گلی — ایک سے دوسری
حتیٰ کہ کوئی ڈیڑھ فرلانگ دور ہمیں لے گیا اور بولا:

"یہ رہا۔ فندق عدن۔" باہر لکھا تھا۔ فندق قصر عدن۔

قسم کی غم کا کردار لگتا تھا۔ ایک زقند میں بیس سیڑھیاں اتر گیا تھا۔ ہم میاں ہڈ ہڈ
 بریک لگاتے تھے۔ رفیقی لا تسرع۔ لا تسرع۔ یعنی میاں باندھ کے
 پل۔ لا تسرع (جلدی مت کر) کا لفظ ہم نے آج ہی سیکھا تھا۔ دمشق کے
 راستے میں ایک ٹرک ہمارے آگے آگے تھا۔ اس کی پشت پر لکھا تھا جیسے ہمارے
 ہاں لکھا رہتا ہے۔ "ہاں دے کر پاس کریں" یا "سامان سو برس کے ہیں کل کی
 خبر نہیں" وغیرہ۔ مطلب ہم نے "لا تسرع" کا اس لئے نکال لیا کہ اس وقت
 ہمیں عربی آرہی تھی۔ ہم مس فرماں سے گفتگو جو کر رہے تھے۔ اب یہی سہی میاں
 ۱۶ پر صرف جو رہی تھی۔

اور آخر پہلے شکستہ محرابی دروازے نظر آئے۔ دیواریں بلاچھت کے جاتے
 یہ پرانے سُوَقی حمیدیہ کی باقیات تھیں یا مسجد کا باب اول۔ اس کے بعد مسجد کا
 دروازہ۔ نعلین کو در بقلین کیا۔ ایک شخص دوڑا دوڑا آیا۔ مسلمان؟ پاکستان؟
 ہم نے جی میں تو کہا کہ میرے دین و مذہب کو تم پوچھتے کیا ہو اس نے تو !
 لیکن بظاہر یوں گویا ہوئے کہ دریں چہ شک۔ الحمد للہ۔ کیا ہم صورت
 سے مسلمان نہیں لگتے؟

حضرت عیسیٰ کا سارہ جامع دمشق میں



ایک شام ماضی کی محرابوں میں

”مکتف بودم بر مزار حضرت یحییٰ علیہ السلام در جامع دمشق“

یہ شیخ سعدی کی آواز تھی جو بچپن سے ہمارے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ان الفاظ سے گستان کی ایک حکایت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ مزار صحنہ مسجد میں نہیں بلکہ عین مسجد کے اندر چھت کے نیچے ہے اور ننگ مرمر کی جالی سے گھرا ہوا ہے اور اس پر ایک بزرگ بند ہے اور ہر چار طرف ہمہ وقت کچھ نہ کچھ لوگ یہاں مکتف رہتے ہیں۔ ہم نے بھی یہاں چند سے اقل کاف کیا۔ یہ شیخ سعدی کے وسیلے سے شرح صدر کی دعا مانگی۔ میاں ہر دہر بھی ہمارے ساتھ دو زانو ہوئے۔ خدا اجل نے انھوں نے کیا دعا مانگی ہوگی۔ ممکن ہے یونہی اُتھا اٹھائے ہوں۔ کیونکہ انھیں ہر سیاح کے ساتھ اٹھانے پڑتے ہوں گے یا پھر یہ کہا ہو گا کہ یا مولا اس اجنبی کے دل میں آج شام سخاوت ڈال۔ اس کے ماتھوں اور بٹوسے میں برکت دے۔ اس کی دعا تو اگر اس نے یہی مانگی تھی ایک واجبی حد تک منظور ہوئی۔ ہماری دعا کا نتیجہ ابھی ٹھکانا باقی ہے۔

مسجد کے اندر دو تین جگہ دعا پڑھا بھی ہو رہا تھا۔ مندر پر آنتی پالتی مارے ایک بزرگ اسلام کی عظمت، ہاضی کا قصہ کہہ رہے تھے۔ لوگ کھڑے کچھ بیٹھے سُن رہے تھے۔ بعضے اٹھ کر دوسرے دعا پڑھنے کے موکھین میں جا شامل ہوتے تھے۔ جو شمالی جانب کے دروازے کے قریب بیٹھا رمضان کے فضائل بیان کر رہا تھا چھت اونچی اور شاندار ہے۔ لیکن زیادہ پرانی نہیں ہے کیونکہ اس مسجد کو ان صدیوں میں بار بار شکست و ریخت اور طوفان غارت و آتش میں سے گزرنا پڑا ہے۔ اب ہم جنوبی جانب کے وسیع برآمدے میں نکل آئے اور جو تاپہن صحنہ مسجد میں سے گزر مشرقی دروازے کی طرف آئے۔ گویا یہاں صحن مسجد میں جو تاپہنا جا سکتا ہے۔ مسجد کے مغربی دروازے کے ساتھ امام غزالی کا مکتب تھا۔ ہم نے اپنے خضر راہ سے اس کا نشان پوچھا لیکن وہ کوئی تاریخ تھوڑی پڑھا تھا۔ اس کا کام تو اڈے سے مسافروں کو گھیر گھار کر ہوٹلوں میں پہنچانا تھا۔ صحن میں پاڑ لگ رہی تھی۔ مرمت ہو رہی تھی۔ اور بارش کی پھسلن تھی اور ہمارے جوتے چکنے فرش پر پڑے جا رہے تھے لیکن میاں ہند ہمارے لا تسرع۔ لا تسرع پر کان دھرے بنا برابر پکے جا رہے تھے مشرقی دروازے سے نکلیں تو باہر پھر اونچی شکستہ محرابیں دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے ہلاکو کی یورش بھی دیکھی ہوگی۔ تیمور کی بھی۔ یہیں وہ مشرقی منارہ ہے جس پر ایک روایت کے بموجب قیامت کے روز حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُتریں گے۔ بائیں ہاتھ کو مڑیے تو سلطان صلاح الدین غازی کی تربت کا قبہ سامنے تھا۔ ایک چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ وہاں ایک بزرگ بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ ایک نوجوان نے اٹھ کر دوسرا دروازہ کھولا۔ اور سامنے اس فاتح کی آرام گاہ تھی۔

جس کے پرچم کے آگے مشرق اور مغرب سرنگوں تھے۔ جس نے یورپ کے متحدہ شکروں کا سامنا کیا اور اپنی فتوحات اور حسن اخلاق کی داستانیں چھوڑ گیا۔ آج جبکہ سرزمین شام کے ایک کونے اور بیت المقدس کو غاصبوں نے دوبارہ لکھا تھا اور فلسطین کے مہاجر صحرائیں در بدر پھر رہے تھے۔ یہ فاتح لمبی تمانے سو رہا تھا ہم نے کہا اسے غازی! اٹھ کر تو اب نہیں اٹھے تو کب اٹھے گا۔ کیا خوب قیامت کا بھی ہوگا کوئی دن اور؟

فاتحہ سے فارغ ہو کر ہم پھر نکلے۔ گھوم کر مغربی دروازے سے دوبارہ مسجد میں داخل ہوئے۔ اب گائیڈ صاحب باہر کھڑے رہے۔ ہم نے پھر ایک بازنگاہوں کو اس رواق کمنے کے نظارے سے سیراب کیا۔ ایک بار پھر مرزا حضرت بیچی پڑھتے اور تصور کیا کہ ہمارے شیخ حضرت سعدی علیہ الرحمۃ جی یہیں کہیں متکلف ہوتے ہوں گے اور اس سامنے کے دروازے سے وہ بولا لنگڑا آدمی داخل ہوا ہو گا جسے دیکھ کر شیخ اپنے پاؤں میں جوتانہ ہونے کا غم بھول کر رب کا شکر ادا کرنے لگے کہ جوتانہ سہی میرے پاؤں تو ہیں۔ ورنہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاؤں نہیں۔ ہم نے بھی شکر ادا کیا کہ ہوس کی تو انتہا نہیں۔ تمام ازل نے ہمیں پہلے ہی ہمارے حق سے زیادہ دے رکھا ہے۔

باہر میاں بہ اپنی لمبی چونچ نکالے ہمارے منتظر تھے۔ ہم ایک بار پھر سوق حمیدیہ کی طرف چلے اور اس کے دروازے پر پہنچ کر ہم نے اسے کچھ دے دیا کر رخصت کیا کیونکہ ہم تو اس شہر کے درو دیوار سے باتیں کرنے آئے تھے یہاں

یاجت کے تھنے پینے نہیں آئے تھے۔ ہمیں حریر اور زری کے سامان نہ خریدنے تھے۔
 بڑے بازار کی چھت تو قدیم نہیں ہے اب تو اسے لوہے کی چادروں سے پانا
 گیا ہے لیکن ایک بھٹی لگی میں ہمیں محرابوں کا ایک سلسلہ نظر آیا اور ہم نے اس میں
 غوطہ مارا۔ اس وقت شام اتر رہی تھی۔ روزہ دار اپنی دکانوں کو بیٹھنے لگے تھے انہری
 گلیوں کو زیر و نمبر کے نیلے بلب ایک آسپی سا اجالا بخش رہے تھے۔ دہنی طرف
 کو ایک بڑا دروازہ نظر آیا۔ یہ مدرسہ ناصر یہ تھا جس کی بنا سلطان صلاح الدین ایوبی کے
 بھائی سلطان ناصر الدین ایوبی نے رکھی تھی۔ آگے لگی اور تنگ ہو کر دہنی طرف کو مڑ گئی
 تھی دونوں طرف کی بالکینوں کے جھروکے ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ یہ پرانے
 جھروکے اڑواڑوں پر قائم تھے لیکن نیچے کی ڈیوڑھیاں اور محرابیں اور طاقے سب
 قدیم تھے چوٹی دروازے بھی عہد پاشاں کی کمائیاں کہتے تھے یہ تھا امویوں کا دمشق۔

دمشق اس وقت بھی آباد تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دین حق کی نواہی
 کی۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ کے عہد میں بھی یہ رونق پر تھا۔ آشوریوں
 اور ایرانیوں کے رایت بھی اس کی فصیلوں پر لہرائے اور سکندر اعظم کے بعد اہل مقدونیہ
 بھی یہاں اپنا سلوک چلا گئے۔ چودھویں سنہ ہجری میں خالد بن ولید کے ہمراہ عبیدہ بن
 جراح اور یزید بن ابی سفیان کے اہل قتل یہ فتح ہوا۔ خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے عہد
 میں اس کی حکومت امیر معاویہ کے ہاتھ میں تھی اور سترہ سو سے یہ امویوں کا پایہ
 تخت اور مقام دوں سلطانیہ کا مرکز بن گیا لیکن یہ طرہ امتیاز اس کی دستار میں فقط
 صدی بھر کو رہا۔ مصر میں خلافت عباسیہ منتقل ہونے کے بعد کبھی یہ مصر کے تابع

رہا۔ کبھی بغداد کے۔ سلجوقیوں کی بعض شاخیں بھی اس پر کچھ دن حکومت کر گئیں اور پھر بدایں و صیدب کے معرکے برپا ہونے شروع ہوئے۔ یہ مدرسہ ظاہر یہ ہے جس کے اندر ملک انظار ہر کا مقبرہ ہے۔ یہ مدرسہ عالیہ ہے۔ جہاں ابن خلدون در کس میتے تھے یہ مدرسہ افتائیہ ہے۔ یہ مدرسہ ڈیوڑھیاں اور محرابیں۔ محرابیں اور طاق جن میں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر ہیں اور ڈیوڑھیاں جن میں سے اندھی اندھی لٹکیاں جلنے لکھ رہی گئی ہیں۔ بظاہر لگی بند معلوم ہوگی۔ سامنے ایک مکان نظر آئے گا لیکن بس وہیں سے خم کھا کر کسی طرف کو نکل جائے گی اور پھر محرابوں کی بھول بھلیاں میں گم ہو جائے گی۔ کہیں چند میڑھیاں اور پھر ڈھلوان لگی اور یہی اوپر۔ اور پھر ایک تختہ نیچے اتر جائے۔ اس جھٹ پٹے میں ساری لگی ہیں بس ایک بچہ کھڑا تھا۔ بولا مہر جا۔ ہم نے کہا: جیتے رہو فونہاں۔ ان محرابوں کے بچوں بیچ کو لکیاں ہیں جن میں کہیں کوئی ٹین گرے کہیں لوہے کا کباڑی ہے۔ کہیں کوئی درزی کپڑے ہی رہا ہے کہیں آگ پر سادار چڑھا ہے اور سامنے کچے پھیلے ہیں۔ ایک جگہ بغیر چراغ جلانے اندھیرے ہی میں ایک بڑھا موچی اپنے یا کسی اور کے جوتے میں کیلیں ٹھونک رہا تھا۔ اب روزہ کھل گیا تھا۔ دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ اور شیشے کے کواڑوں کے پیچھے لوگ میز کے گرد بیٹھے افطار کر رہے تھے۔ جمش یعنی کابلی چنے کی کھٹائی دار وال میں چھپ چل رہا تھا۔ یہ دمشق تھا۔ مکتبوں کا دمشق۔ پرانی داستانوں کا دمشق۔ الفیلوی دمشق۔ ایک لگی میں ہم نکلے تو بس ایک دکان ایک نواز کی کھلی تھی۔ میپ کی روشنی میں بیٹھا حساب لکھ رہا تھا۔ سامنے لگی کے اس طرف ایک آدمی ڈھکی ہوئی گنبد دار عمارت کھڑی تھی۔ ہم نے پوچھا: کیوں میاں جی یہ مسجد ہے؟ بوسے ہاں۔ ہم نے کہا۔ نام اس کا کیا ہے معلوم ہوا۔ یہ

سلطان صلاح الدین کے آقا سلطان نور الدین شہید کی مسجد ہے اور اسی کے اندر اس کی تربت ہے۔ ڈیوڑھی بے چراغ تھی۔ ہم وہ بے پاؤں اندر گئے تو صحن میں بھی کوئی نہ تھا ان صحن سے پرے ایک دروازہ تھا اس کے پچھے شاید کوئی ہوگا۔ ہم نے وہیں سے فاتحہ پڑھی اور اٹے پاؤں لوٹ آئے۔ رات اتر آئی تھی۔ چل حسرت گھراپنے سانجھ بھئی چوڑی۔ لیکن میں تو کوئی جلدی نہ تھی۔ ہم تو ان گلیوں میں گم ہو جانا چاہتے تھے جذب ہونا چاہتے تھے، یہاں کسی گائیڈ کی حاجت نہ تھی۔ گائیڈ تو رستہ ڈھونڈنے اور پتہ رکھنے کے لئے ہوتا ہے۔ گم ہونے اور بھولنے اور اپنے آپ کو کھونے کے لئے گائیڈ کی کیا حاجت۔ اور پھر ہم ان تاریک کچر بھری گلیوں میں گم ہو گئے۔ کچھ یاد نہ رہا کہ کدھر کو جانا ہے۔ یہی گندی کچر بھری گلیاں ہی تو ہمارے ماضی سے ہمارا رشتہ تھیں۔ ایک جگہ پھر کسی مدرسے کی ادنیٰ ڈیوڑھی نظر آئی۔ ہم نے نام پڑھنے کے لئے ماحس جوائی لیکن کچھ نہ پڑھ سکے۔ گلی دور دور تک سنان تھی۔ ایک جگہ چراغ جل رہا تھا۔ وہ ایک آدمی ایک پیالہ لئے ہوئے نکلا اور پیشتر اس کے کہ ہم اس سے پوچھتے یا رفتی یا کوں سا مکتب ہے۔ دوسری گلی میں غائب ہو گیا۔ اور پھر اندھیرے سے مسجد اموی کے مینار پیدا ہوتے اور ہم نے حساب لگایا کہ ہم اس کے جنوبی دروازے پر نکل آتے تھے۔ یہاں ایک چبوترہ تھا۔ چبوترہ تو نہیں ایک نیچی دیوار تھی۔ پرانے وقتوں کے کسی پشتے کا حصہ۔ ہم ٹھیکسی لینے کو رک گئے بیٹھ گئے۔

اور پھر اس پشتے کے نیچے سے کوئی بولا: یہاں ایک مندر تھا میں اس مندر

کی آخری اینٹ ہوں۔ اس کے اوپر کاروا بولا۔ میں اس کھیا کی دیوار ہوں جو رومن
 قیصر آرمیس نے اس مندر کی جگہ پانچویں صدی عیسوی میں بنایا اور پھر اس کے اوپر
 کے پتھر بے۔ ہم اس خانہ خدا کے قدیم پتھر ہیں اور ہمیں پہلی صدی ہجری میں ولید
 بن عبد الملک بن مروان نے یہاں جمایا تھا۔ بارہ ہزار کاریگر اور مہمار اور سنسکرت
 بلا دروم سے آئے تھے اور شب و روز کام کرتے تھے۔ ایک کے بعد ایک سلطان
 خلیفہ، پاشا، صوفی، درویش، متکلم، بیاں آکر مسجد ریزہ ہوتے۔ ناگیاں شور مارتی تھیں۔
 فصیلوں پر چلو، فصیلوں پر چلو۔ یورپ کے تہران صلیبی پرچم لئے منزلیں مارتے
 یہاں آپہنچے تھے۔ یہ فرانس کے لوئی ہفتم کا لشکر جہاد ہے وہ جرمن کے قیصر
 کونارڈ سوم کے زرہ پوش نائٹ گھوڑے بڑھاتے آرہے ہیں۔ فصیلوں پر چلو۔
 فصیلوں پر چلو۔ محاصرہ۔ تیغوں کا رن پڑتا ہے۔ منجیقیں چلتی ہیں! اللہ اکبر
 اللہ اکبر۔ اور پھر یہ بادل چھٹ جاتا ہے۔ اب ایوبیوں کا دور دورہ ہے۔ سلطان
 صلاح الدین اپنے سمند پر سوار تشریف لاتے ہیں۔ گلیوں میں ٹھٹ لگے ہیں۔
 نقارہ بجتا ہے۔ ایوبی پرچم کھلتا ہے اور کھلتا چلا جاتا ہے اور بیت المقدس کو
 اپنے سایے میں لے لیتا ہے۔ اور پھر یہ نقارہ کسی اور قسم کے شور میں دب
 جاتا ہے۔ یہ کیا جوا۔ یہ کیسے هجوم ہیں۔ یہ سلطان غازی کی ریت لہریں آتاری جاری
 ہے۔ کل من علیہا فان۔ کل من علیہا فان۔ لیکن دیکھو یہ پتھر گھوڑوں کی ٹاپوں
 کا شور گونجا۔ فصیلوں پر چلو۔ فصیلوں پر چلو۔ یہ ہلاکوخاں کی فرج بے اماں ہے۔
 گلیوں، محرابوں، ڈیوڑھیوں کے دروازے بند ہو گئے۔ اور پھر ہلاکوخاں فصیلیں حیر
 کر چڑھ آیا اس مسجد کو جلا دو۔ ڈھیر کر دو۔ یہاں ہماری مشہرہ بچا دو اور پھر مسجد کی

پھت جلتے لگی۔ ڈھیر ہو گئی۔ دمشق کے آسمان پر دھواں ہی دھواں پھیل گیا اور جب مطلع صاف ہوا تو ہلکے بے نشان ہو چکا تھا۔ ایمان والوں نے مسجد پھر کھڑی کر دی تھی۔ ایک بار پھر مشرقی منارے سے پچاس مؤذنوں نے لی کر اذان دی۔ پھر مدرسے کھلے لیکن یہ دمشق تھا۔ ابھی اسے اور روندنا جانا تھا۔ اب تیمور لنگ کی باری تھی۔ پھر فصیل شق ہوئی۔ طبل بجا۔ رایت کھلا اور دمشق غارت ہوا اور پھر مسجد سے شعلے بلند ہوئے اور اس کی لٹہ لٹہ محرابیں اور دیواریں باقی رہ گئیں۔ یہ لشکر لوٹا تو دمشق کے بے مثال قالین بافوں کو بھی ہانکنا ہوا سا تھا لے گیا۔ ان کو ماوراء النہر میں آباد کرو۔ دمشق کو اجاڑ دو۔ لیکن مسجد پھر کھڑی ہوئی دمشق پھر آباد ہوا حتیٰ کہ سلطان سلیم اول نے اسے تسخیر کیا۔ ایک کے بعد ایک سلطان کے نام کے خیلے بیاں پڑھ گئے۔ اور آخر ترکوں نے بھی گھوڑوں پر زینیں کیں اور رخصت ہو گئے۔ پھر ایک دھواں دھار جنگ ہوئی۔ پھر فرانسیسی ان گھیبوں میں دندنانے لگے۔ لیکن یہ محرابیں یہ ڈیوڑھیاں یہ آثار کوئی نہ مٹا سکا۔ دمشق تو گنج شہیداں ہے چلو فاتحہ پڑھو۔ حضرت بلال حبشیؓ کے مزار پر۔ عبداللہ بن مکتومؓ کی تربت پر۔ عمر بن عبدالعزیزؓ کی قبر پر سیدہ زینب۔ سیدہ سکینہ۔ اسماء بنت ابوبکر۔ سیدہ فاطمہ صغیرہ بنت ام حنینؓ ان قبرستانوں کے پھیلے ہوئے کھنڈروں میں کس کس موتی کو تلاش کرو گے۔ اور پھر ایک طرف سے تلاوت کی شیریں آواز آئی شروع ہوئی۔ اسے دمشق رخصت۔ اسے جامع اموی۔ اسے عظمت رفتہ کی مسجد گاہ السلام لیکن ابھی کہاں۔ ابھی تو دمشق کی لگیاں باقی ہیں ہم نے سڑک پار کی اور ویدیش پاشا کی تربت کے پاس سے کاداکاٹ کر پھر اندھی گلیوں کی محرابوں میں گم ہو گئے۔

جونیہ سے طرابلس تک

یہ بیروت ہے اور یہ بیروت میں ہماری آخری شام ہے اور خدا کو منظور ہوا تو
ہمارے سفر کی آخری شام بھی۔ بیروت کا طوفانی سمندر دوراتوں سے بے طرح شور
کر رہا ہے اور ہمیں اپنے ساحل پر بلارہا ہے جہاں آج کل شام کو دُور دُور تک کوئی
متنفس نہیں ہوتا۔ گرمیوں کی شاموں کو میں ہم نے لوگوں کے میلے دیکھے تھے۔
تربوز، بجھے اور نان پکتے پاتے تھے۔ آج نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں۔ نہ وہ حسن
میں رہیں شوخیاں۔ یا تو موسم کے ساتھ رخصت ہو گئیں یا چار دیواریوں میں،
دیوان خانوں میں محصور ہو گئیں۔

شام ہے۔ تاریکی ہے۔ ابر ہے۔ بوندیں برس رہی ہیں۔ تھوڑے تھوڑے
وقفے سے بادل بھی گرج اٹھتا ہے اور اس طوفان کے باوجود دُور ابر کی ڈھلڑیوں
کے درمیان سے جانے کس تاریخ کا چاند جھانک رہا ہے۔

وہ سامنے حریفی کی پاڑیاں نظر آتی ہیں اور اس کے دامن میں جونیہ قریب ہے
جہاں ہم نے پچھلے ہفتے ایک دن گزارا تھا۔ بس حلا الشیخی کرناں ہماری رہافت

پر مامور ہیں اپنی کار لے آئی تھیں اور منزل ہماری المکتبہ ابوسیدہ تھی یعنی سینٹ پال پبلنگ ادس۔ سینٹ پال ہوٹل سے سینٹ پال کھیتے تک... جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔ سوئے دار کی رعایت سے اس کھیتے کی چھت پر صلیب بھی نصب تھی۔ اور اس کے پیچھے کا پاڑ بھی کھساؤں اور صلیبوں سے پٹا تھا اور حریصا کے پاڑ کی چوٹی پر ایک یسائی دیوی کی بہت بڑی شبیہ تھی جس پر رات کو اس انداز سے روشنی ڈالی جاتی ہے کہ سارے میں ہی چھپاتی دکھائی دیتی ہے۔ دوسرے گرجاؤں کی صلیبیں بھی رات کو روشنی ہو جاتی ہیں کسی مسجد کا مینار ان پاڑیوں پر نہیں نظر نہ آیا۔

جو یہ ہیں ہم نے مین کنارہ بھر پر مہربان اور شفیع اور یہ پوش فادر جورج بالکی کے ساتھ کھانا کھایا اور لستی پی۔ ہماری نظر جو فراز کوہ کی طرف اٹھی تو بولے چلو گے اوپر؟ ہم نے کہا: کیسے؟ بولے۔۔۔ بھلی کے جھولے میں بیٹھ کر۔ جھولے میں بیٹھ کر لوہے کے تاروں سے ٹکے پاڑ چڑھنے اترنے کے مواقع ہمیں جاپان میں بھی ملے اور سوئٹزرلینڈ میں بھی۔ لیکن ہم نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا۔ یہاں ہم نے پناہی کر لیا اور کہا: اہ کیوں نہیں۔ فادر بالکی کے ایک جوان ساتھی نے جھولے میں چڑھنے سے انکار کر دیا کہ مجھے تو ہول آتا ہے۔ بس سلاشینبی بھر چر کر کرتے ہوئے شرما شرما کر چارے ساتھ سوار ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد جب انھوں نے نیچے جھانکا اور زمین کو سخت آسمان کو دُور پایا تو ان کا دل بھی ڈوبنے لگا۔

اور خوف کے مارے ہمارا اچھکڑا کر ہم سے سمٹ کر بیٹھ گئیں۔ یہ مقام خط الہی یہ گھٹا دو دن تو برے سے — کی دعا کا تھا۔ لیکن ہم جو جہاز

میں بیٹھے کبھی نہ بگھڑائے تھے۔ یہاں محض فادر اور مہس حلا کو دکھانے کے لئے ہنس
ہنس کے باتیں کرتے رہے۔ سچ یہ ہے کہ دل ہمارا بھی بیٹھا جا رہا تھا۔ چڑھائی
اتنی زیادہ اور مسافت ایسی خاصی ہے کہ اوپر سے یہ بھی مشکل سے نظر آتا تھا کہ ہم
کہاں سے چلے تھے۔ اب ہم قلعہ کوہ پر تھے فادر ہمیں پاس کے گرجا میں لے گئے
جس کے اوپر لبنان کی سب سے بڑی مورتی ہے۔ اسے شرمیوت کی محافظ کہا جاتا
ہے۔ یہ گرجا عجیب و غریب ساخت کا تھا اور یہاں سے گرد و نواح میں میں میں
میل دور تک دیکھا جاسکتا تھا۔ فادر نے صلیب کا نشان بنایا۔ ہم ہلال ولے کھڑے
دیکھتے رہے۔

جن پیشروں سے ہم ملے اور بیروت کے پیشتر تو ایک صدی سے مشہور ہیں
ان میں سے بیشتر عیسائی ہیں۔ انہی نے پرانا عربی ادب چھاپا ہے اور اسلامی کتابیں
بھی۔ یہ لوگ لبنان کے نوکشور ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ یہ کتابیں بہت خوبصورت
چھاپتے ہیں۔ مولوی محبوب عالم نے اپنے سفر نامے میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ
مطبع الکا تو لیکہ اور مطبع آباءتے یسوعین میں گئے تھے اور ڈھیروں کتابیں خریدی
تھیں۔ ہماری عربی کسی قابل نہ تھی پھر بھی ہم نے کچھ کامیابی کی شاعروں کے دیوان
لئے۔ دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ بیروت کے دوسرے کاروباریوں کے
بورڈ پڑھئے تو بھی غالب اکثریت عیسائیوں کی نظر آئے گی۔ مسلمانوں کا دعوے
ہے کہ ان کا تناسب اب عیسائیوں کے برابر ہے۔ مولوی محبوب عالم نے ۱۹۰۰ء
میں لکھا تھا کہ شہر میں مسلمان فقط ایک چوتھائی ہیں۔ عربی زبان سے محبت اور
اسرائیل کی مخالفت میں ہم نے ان عیسائیوں کو مسلمانوں سے کم شمیر رہنے نہیں پایا۔

اگے روز اسی راستے ہم طرابلس گئے تھے۔ طرابلس دو ہیں۔ ایک طرابلس الغرب
 جریڈیا میں ہے اور ایک یہ کہ امیازکے لئے طرابلس الشام کہلاتا تھا۔ یہ لبنان کے
 انتہائی شمال میں ہے۔ اس کے بعد شام کی سرحد پار کریں تو سلب کے نواح میں
 جا پہنچیں گے۔ اسی ساحلی سڑک پر جُزینہ سے کچھ آگے بلوس کا قدیم شہر ہے۔ جہاں
 دنیا کے پہلے حروف تہجی ایجاد ہوئے اور زبان نے تحریر کا روپ پایا۔ لبنان قدیم
 زمانے میں فریشیا کہلاتا تھا۔ اور یہاں کے لوگ فیثقی دنیا کی قدیم تہذیبوں میں
 ممتاز و جہر رکھتے ہیں۔ یہ سمندری طاقت تھے اور ان کے سفینے روم اور کارتیج
 تک مار کرتے تھے۔ بلوس کے نئے شہر کے پہلو میں پرانے آثار میں سے کچھ تو ہمار
 اور پانچ ہزار سال پہلے کے مندروں کی باقیات ہیں جن کے گرد تین ہزار سال قبل
 مسیح کی فصیل کا کچھ حصہ اب بھی کھڑا ہے۔ عین ساحل پر ایک فرنیٹش قلعہ ہے۔
 صلیبوں کے زمانے کا۔ ولادت مسیح سے چار ہزار سال قبل یہ شہر سواحل فریشیا کا دارالطو
 تھا اور بابل کا نام اس شہر کے نام بلوس سے مشتق ہے اسے دنیا کا قدیم ترین
 شہر بھی کہتے ہیں۔

طرابلس کہ اصل میں تریپولی یعنی ”سر شہر“ ہے۔ قدیم زمانے میں صدر صید اور
 اردو تین شہروں کے مہاجرین نے آباد کیا تھا اور ہر جماعت عینہہ محلہ اور فصیل کے
 اندر رہتی تھی۔ رومیوں کے عہد میں یہ بڑا سربراہ دورہ شہر تھا اور مسلمانوں کے عہد میں بھی
 یہاں سے ریشم اور برتن و سادہ کو جاتے تھے سلطان صلاح الدین ایوبی اور سلطان
 برکس نے اس کا محاصرہ کیا۔ آخر سلطان قلاؤن نے اسے فتح کیا۔ یہاں صلیبیوں نے
 کا ایک قلعہ۔ ۷۱۱ھ جامع۔ بہت سے پرانے عہد سے اور کتب خانے۔ بارہ پرائی عیسوی

خافیاں اور تجارت کے بازار ہیں۔ نیا طرابلس توجید شہر ہے لیکن رانا شہر اپنے
مکتبوں، جامعوں اور محراب دارگیلوں کے ساتھ چھوٹا دمشق کمانے کی سعی ہے۔
ہم قلعے کے دروازے پر پہنچے تو اسے بند پایا۔ کچھ بچے کھیل رہے تھے ان
کی زبان ہمارے اور ہماری ان کے پلے نہ پڑی۔ اتنے میں ایک نوجوان باسکٹ
پینے آتے دکھائی دیئے۔

ہم نے پوچھا۔ انگریزی دیتے ہو؟

جواب ملا: ہاں بروتا ہوں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی انگریزی آٹھ دس لفظوں تک محدود تھی۔ نام
ان کا احمد تھا۔ بولے اردو بھی بول سکتا ہوں۔ ہم نے کہا: بولو، فرمایا: بہت
اچھا۔ پتہ چلا کہ ان کو یہی لفظ آتا ہے۔ ”بہت اچھا“۔ جانے کہاں سے سنا تھا۔
یہ بیچارے بہت جیسے آدمی تھے۔ انھوں نے قلعے کے دروازے پر جا کر بابا علی
کو بہت آوازیں دیں لیکن آج بابا علی نے پہلا روزہ ہونے کی وجہ سے جلد دروازہ
بند کر دیا تھا۔ احمد میاں نے کہا: اب آپ شہر جائیے، چھ بجے کے بعد آئیے
اُس وقت بابا علی کا جی چاہا تو آپ کے لئے دروازہ کھول دے گا۔ آپ ایک آدھ
ایرا نذر کریں تو دروازے کا کھلنا بڑی حد تک یقینی ہے۔

ہم نے کہا۔ اچھا، اب ہمیں بازار کا راستہ بتاؤ۔ بازار تو ہم پہنچ گئے لیکن
وہ بھی بند ہو رہا تھا۔ طرابلس کی یادگار کے طور پر ہم نے کچھ خریدنا چاہا۔ سلسلے
کبلوں کی دکان تھی۔ ہم نے ایک کبل لیا۔ بھاؤ تاؤ کی غنچائش نہ تھی کیونکہ دکاندار افطار
کے لئے گھر جانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ بھاؤ تاؤ کرنا ہے تو کل صبح آکر۔ ناچار

ہم نے پیسے دیئے اور کھل کر بغل میں مارا۔ یہاں میاں احمد بھی سلام علیک کر کے ہم سے رخصت ہو گئے۔ اور ہم طرابلس کی گلیوں میں گھومنے کے لئے تیار ہو گئے۔

اس مسافت میں ہمارا کھل بہت نخل انداز ہوا۔ ہم اسے ایک بغل سے دوسری میں منتقل کرتے رہے حتیٰ کہ ایک بار تو ہم اسے چھوڑنے پر بھی آمادہ ہو گئے تھے لیکن اب یہ ہمیں نہ چھوڑنا تھا۔ طرابلس میں دیکھنے کی چیزیں تو بہت ہیں لیکن وقت کہاں تھا۔ مدرسوں اور مسجدوں اور محرابی بازاروں میں تو ہم بھانکے اور دُور دُور تک گئے لیکن قلعہ نہ دیکھ پائے۔ معلوم ہوا صبح دم دروازہ خاور کھلے گا تو یہ بھی کھلے گا۔

پہلے خسرو گھر اپنے سانجھ جی چور دیں۔ یہ تین مہینے بڑی مشکل سے تمام ہوتے ہیں اور ہم بغداد کا پردگرم منسوخ کر کے سیدھے کراچی آرہے ہیں کیونکہ اے ہماری گفتوں، عشرتوں اور حسرتوں کے شہزادہ ہم تجھ سے دُور نہیں رہ سکتے۔ آوارہ گردی سے ہم نے اپنے دامن میں دیں دیں کی خاک تو جمع کر لی ہے لیکن ہمارے دُور دہی ہیں کہ جوتھے۔ اور دریاں دہی ہیں کہ جوتھے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی دیکھا۔ یہ دریائے سین ہے۔ یہ ٹیمر ہے۔ یہ مین ہے۔ یہ رات یہ ایسٹر۔ یہ رہی حنینا کی جھیل۔ اور یہ ہے زیورخ کا بحیرہ۔ دریائے وناوار۔ دریائے دستا۔ دریائے ڈینیوب۔ دریائے نیل ادنا ب بحیرۃ مدیم 'پانی ہی پانی' اس کے باوجود پیاس ہی پیاس۔

یہ کیا صدا کافوں میں آرہی ہے۔ گر جا کا گھر مال ہے۔ یا بانگ ریل ہے۔ اے مسافر اپنے آفری پڑاؤ سے اٹھ۔ الوداع اور کجاوے میں زاد سفر دکھ کہ آج

تیرا قافلہ جاتا ہے اے بلادِ مغرب کے شہر و خدا حافظ۔ اے پیریں کے چوک۔ لندن کی گلیوں۔ برلن کی سڑکوں۔ ایسٹروم کے بازاروں۔ جنیوا کے مناظروں۔ برن اور لوسرن کے بسزہ داروں۔ پراگ کے قلعوں۔ وارسا کے خرابوں۔ ویانا کی مجلسوں۔ قاہرہ کی مسجدوں۔ دمشق کے مکتبوں اور طرابلس کی محرابوں اور بیروت کی روشنیوں تمہیں بھی الوداع۔

آج ہم اپنے سفر کی بادہویں ولایت اور ستائیسویں شہر کو خیر باد کہیں گے۔ اے وقت تیز ترک گامزن۔ اے گھر کی سویٹو۔ چلو چلو چلو۔ نسیم خوشدلی از فتح پور می آید۔ بس ایک شام اور دمِ میان ہے۔ پھر ہم اپنی کمر کھولیں گے۔ جوتوں سے ان رہ گزاروں کی گرد بھاڑیں گے۔ مسافت کے دنوں اور ہم سفروں اور مہربانوں اور میزبانوں کو یاد کریں گے۔ صحتوں کو بھول جائیں گے۔



درسہ اور مدرسہ کے شاگرد و مشق میں



چل خسر و گھراپنے

ایک بار ہمارے دوست ممتاز مفتی کے راولپنڈی سے کراچی آنے کا پرچہ لگا۔ تو ہم نے اور احمد بشیر نے ان کے خیر مقدم کے لئے لارنس روڈ سے کھن بینڈ والے کا باجا کولتے چرلیا۔ پوری ٹیم لینے کی تو قدرت نہ تھی نہ ہمیں خود ڈھول پٹیا اور نفیری بجانا آتا ہے۔ بس ایک آدمی کی فیس دی۔ اس نے ترّت ٹکے میں سے نکال کر اپنی ذرق برق جھاروار یونیفارم زیب تن کی اور ہمارے ساتھ ہو گیا۔ یہ بالکل ایک ہاتھ سے ڈھول بجاتا تھا۔ دوسرے میں ترم پکڑے تھے۔ یہ تو دو ساز ہوئے یورپ میں تو جہاں لیبر جنگی ہوتی ہے۔ گلے میں تاشہ کہاڑوں کے پالکی میں ڈھول کا حساب ہمیشہ رہتا ہے۔ ایک آدمی تین تین چار چار باجے ایک ساتھ بجاتا ہے۔ منہ والا باجہ ہاتھ سے پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ ڈھول کے ساتھ ایک کمانی لگی ہے اس میں وہ اٹکا رہتا ہے۔ ایک ذرا گردن جھکائی اور چھوڑک لگائی۔ اب دونوں ہاتھ فارغ ہیں۔ ایک سے ڈھول پر چوٹ لگائیے۔ دوسرے سے جھانجھ بجائیے یا سر کھجائیے۔ بہر حال ممتاز مفتی صاحب اس جلوس میں اس ایک

ایک شاعر نے تو ایک پارے فارسی مصرعے — ”چو بیا بد بنوز —“ اٹھ سے تاریخ بھی نکلانے کی کوشش کی۔ غنیمت ہوا کہ نہیں نکلی۔

یہ سارا جی جلانے کا سامان تو تھا لیکن جب ہم نے پوچھا کہ لوگوں کا ہے کہاں ہیں۔ جلوس کہہ رہے۔ کیا ایک آدھ ہار بھی تم نہ لا سکتے تھے۔ پیسے ہم دے دیتے۔ یہ کیا تماشا ہے تو سب آئیں پائیں شائیں کر کے رہ گئے۔ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ خیر میاں آزاد۔ آج کل کے دوست ایسے ہی ہیں۔ ان کا گلہ نہ کرنا چاہیئے۔

لیکن آنے والی جہنم آج کو سب سے پہلے کسٹم کے پلوں کے نیچے سے گزرنے پڑا۔ ہمارے پاس ایک سوٹ کیس تھا۔ ایک اور سوٹ کیس۔ ایک تھیلا۔ ایک اور تھیلا اور ایک اور تھیلا۔

کسٹم انسر نہایت مستعد آدمی تھے۔ فرمایا :

Have you anything to declare?

’ہم نے کیا: ہم خدا کو حاضر ناظر جان کر اعلان کرتے ہیں کہ گزشتہ رات صلاۃ بقیہ عمر ملک اور قوم کی خدمت میں بسر کریں گے، خواہ اس کے لئے ہمیں اسمبلی میں کیوں نہ جانا پڑے۔‘

بولے : اس قسم کے اعلان سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ کے سامان میں کوئی چیز ایسی تو نہیں جو قیقتی ہو جس پر کسٹم ملتا ہو۔ ہم نے کیا: کیوں نہیں۔ بڑی بڑی انمول چیزیں ہیں۔ ہم نے تھیلے میں ہاتھ

ڈال کر ایک چرنکالی۔ یہ تھی انگلش جرمین اور جرمن انگلش ڈکشنری۔

بے توجہی سے دیکھ کر فرمایا: ”اور کیا ہے؟“

اب کے ہم نے اتھ ڈالا تو فریچ انگلش اور انگلش فریچ ڈکشنری دستیاب ہوئی۔

فرمایا: ”اس کے نیچے کیا ہے؟“

وہاں سے ڈیچ زبان کی لغت برآمد ہوئی۔

اب انھوں نے تھیلے کے خود ٹٹولا۔ اس کے نیچے چاک زبان کی لغت تھی

پولش زبان کی روزمرہ بول چال کی کتاب تھی۔ آٹالین زبان کی گرامر تھی۔

بولے: بس؟

ہم نے کہا: بس کیوں۔ عربی زبان کے لغات اس دوسرے تھیلے میں ہیں

ان کے علاوہ ہر شے کی گائیڈ بک، نقشہ اور پکچر کارڈ ہیں، دکھائیں نکالی کر؟

بولے: نہیں

اب انھوں نے ہمارے سوٹ کیس کو ٹوکا دیا اور کہا یہ بھی ذرا دیکھیں۔

وہاں بس کچھ کپڑے تھے ہمارے۔ کچھ پرانے کچھ نئے۔ ”وصلی ان وصلی

بنیائیں۔ موزے وغیرہ۔ مولوی محبوب عالم کا سفر نامہ۔ ہمارا غیر مطبوعہ دیوان۔

ایک ڈبہ ہم نے ان کپڑوں کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ ہمارا خیالی تھا اس پر کسی

کی نظر نہ جاتے گی لیکن کسٹم دالوں کی نگاہیں بہت تیز ہوتی ہیں۔ انھوں نے اسے

کھینچ لیا۔ ہم نے کہا: نہ نہ۔ اسے مت کھولنے گا۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے لیکن انھوں

نے کھول ہی لیا۔

اس ڈبے کے اندر سے ایک اور ڈبہ نکلا۔ اس کے اندر ایک اور —

ایک اور — اب لغات شروع ہوئے ایک کے اندر دوسرا — دوسرے کے نیچے



تیسرا — بڑے لغافے — درمیانے لغافے — چھوٹے لغافے — سب سے اندر کا لغافہ انھوں نے کھولا۔ اس میں کچھ بھی نہ تھا۔
 فرمایا: اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔

ہم نے کہا: کیوں نہیں ہے؟ آنکھوں والوں کے لئے بہت کچھ ہے۔ ہم سے پوچھئے، ہم جانتے ہوئے اپنے ہاں کی ہینڈی کرافٹ شاپ سے کچھ تحفے لے گئے تھے، ان لوگوں نے اخبار میں یا براؤن پیسر میں بازہ کر دیتے تھے، ہمیں بہت شرم آئی، اب یہ دیکھئے، یورپ والے کتنی عمدہ پکنگ کرتے ہیں۔ اس ڈبہ میں ہمارا سوٹ تھا اور اس دوسرے میں جوتا تھا۔ باقی لغافوں میں ہماری قمیضیں اور سوٹر وغیرہ تھے۔ اس لغافہ میں ہم ایک بارڈل روٹی لائے تھے۔ لوگ تو ایسی چیزیں بے پروائی سے پھینک دیتے ہیں، ہمارے جی نے یہ گوارا نہ کیا۔ سینٹ سینٹ کر سکتے رہے۔ اب یہ چیزیں ہم اپنے دکانداروں کو دکھائیں گے اور شرم دلائیں گے کہ تم لوگ ایسے ڈبوں اور لغافوں میں چیز رکھ کر دیا کرو تو ہم کیوں نہ ہیں۔ جب ہم ولایت میں اتنی ڈھیر ساری خریداری کرتے ہیں تو یہاں کے دکاندار تو پھر اپنے بھائی ہیں، اپنے گرامی ہیں..... یہ سارے ڈبے اور لغافے جمع کرنے اور رکھنے میں میں اتنی محنت کرنا پڑی۔ جرمنی سے، انگلستان سے، ہالینڈ سے، سوئٹزرلینڈ سے اور آپ نے ٹکاسی زبان ہلا دی کہ اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ جیسے یہ سب رومی چیزیں ہوں۔

فرمایا: جائیے صاحب جائیئے،
 ہم نے کہا: یہ تیسرا تھیلا بھی دیکھ لیجئے!

ہوئے، نہیں، نہیں، نہیں نہیں — جاپئے، ہوا یہ کہ ایک اور صاحب اگر ان کے کان میں کہہ گئے کہ یہ تو فلاں صاحب ہیں۔ کیوں اپنا وقت ان پر ضائع کرتے ہو یہ بھی اچھا ہوا۔ کیونکہ ہمارے تمام میرے اور زمرہ پونڈوں اور ڈالروں کے نوٹوں کی گڈیاں سونے کی اینٹیں، جڑاؤ گھڑیاں، سلک کے تھان، ایفم اور کوکین وغیرہ کے ڈسے اسی تھیلے میں تھے۔

ڈائری لکھنے اور چھپوانے کا فائدہ یہ ہوا کہ اجاب کو اپنے متعلق عجیب طرح متفکر پایا۔ رونی صورتیں، سوکھے چہرے، ہمدردی لبوں پر۔ معلوم ہوا ہماری فلاکت اور بے زوری کا سن کر بعضوں نے تو ہمارے لئے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا ہے ابنِ انشا ریلیف فنڈ کھول دیا ہے جس میں دیئے جانے والے عطیات پر ٹیکس بھی معاف رہے گا۔ بعض اہل درد و کا اندازوں اور چائے خانوں والوں نے بھی جو جنگ پڑھتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے نام کی صندوقچیاں کوٹر پر رکھ دی ہیں۔ جن لوگوں سے ہمیں اس قسم کے تقاضے کا کٹھکا تھا کہ ہمارا ٹیپ ریکارڈ کدھر ہے ہمارا کیمبرہ نکالو وغیرہ۔ انہوں نے بلایس لے کر اور آنسو پی کر کہا۔ میاں تم آگئے ہو سب چیزیں آگئیں۔ بلکہ ایک مہربان نے تو ہماری دہلوی کے لئے ایک ٹرانزسٹر بھی بازار سے خرید کر ہماری نذر کیا ہے +